يَاأَيُّهَا النَّاسُ! قَدْ أَظَلَّكُمْ شَهْرٌ عَظِيمٌ

(اے لوگو، تم پر ایک عظمتوں والا مہینہ سایہ فگن ہو چکا ہے)

روزہ اور قرآن

عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ عَمْرٍو أَنَّ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ:

الصِّيَامُ وَالْقُرْآنُ يَشْفَعَانِ لِلْعَبْدِ يَقُولُ الصِّيَامُ: أَيْ رَبِّ إِنِّي مَنَعْتُهُ الطَّعَامَ وَالشَّهَوَاتِ بِالنَّهَارِ فَشَفِّعْنِي فِيهِ، وَيَقُولُ الْقُرْآنُ: مَنَعْتُهُ النَّوْمَ بِاللَّيْلِ فَشَفِّعْنِي فِيهِ، فَيُشَفَّعَانِ۔

(رواہ البیہقی فی شعب الایمان)

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: روزہ اور قرآن دونوں بندے کی سفارش کرینگے (یعنی اُس بندے کی جو دن میں روزے رکھے گا اور رات میں اللہ کے حضور کھڑے ہو کر اُس کا پاک کلام قرآن مجید پڑھے گا یا سُنے گا) روزہ عرض کرے گا اے میرے رب! میں نے اس بندے کو دن میں کھانے پینے اور نفس کی خواہش پُورا کرنے سے روکے رکھا تھا آج میری سفارش اس کے حق میں قبول فرما۔ اور قرآن کہے گا کہ: میں نے اس کو رات کو سونے اور آرام کرنے سے روکے رکھا تھا، خداوندا آج اس کے حق میں میری سفارش قبول فرما۔ چنانچہ روزہ اور قرآن دونوں کی سفارش اُس بندہ کے حق میں قبول کی جائے گی (اور اس کے لیے جنت اور مغفرت کا فیصلہ فرما دیا جائے گا)۔

وَمَن يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا

(البقرہ: ۲۶۹)

K-36

ماہنامہ

حکمتِ قرآن

لاہور

بیادگار: ڈاکٹر محمد رفیع الدین، ایم اے، پی ایچ ڈی، ڈی لٹ، مرحوم

مدیر اعزازی: ڈاکٹر ابصار احمد، ایم اے، ایم فل، پی ایچ ڈی

معاون: حافظ عاکف سعید، ایم اے (فلسفہ)

ادارہ تحریر: پروفیسر حافظ احمد یار، حافظ خالد محمود خضر

جلد ۱۶ — رمضان المبارک ۱۴۱۷ھ - جنوری ۱۹۹۷ء — شمارہ ۱

— یکے از مطبوعات —

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

۳۶-کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور ۱۴ - فون: ۵۸۶۹۵۰۱

کراچی آفس: ۱۱ داؤد منزل متصل شاہ بحری، شاہراہ لیاقت کراچی فون: ۲۱۶۵۸۶

سالانہ زرِ تعاون -/۸۴ روپے، فی شمارہ -/۸ روپے

مطبع: آفتاب عالم پریس ہسپتال روڈ لاہور

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

حرفِ اول

گزشتہ پانچ چھ ماہ سے "حکمت قرآن" کے صفحات میں "ایک اہم اقتصادی مسئلہ اور اس کا حل" کے عنوان سے جو بحث چل نکلی ہے' اس کا یہ فائدہ تو یقیناً ہوا ہے کہ اس بحث کے بعض نہایت اہم گوشے اجاگر ہو کر سامنے آئے ہیں اور اسلامی اقتصادیات پر نظر رکھنے والے ایک جید عالم دین مولانا محمد طاسین صاحب کی رائے بھی وضاحت کے ساتھ سامنے آئی ہے' تاہم معاملہ کی نزاکت اور اہمیت کے پیش نظر یہ کہنا شاید مشکل ہو گا کہ موجودہ دور کی معاشی پیچیدگیوں کے تناظر میں مسئلہ زیر بحث کا کافی اور شافی حل دیا جا چکا ہے۔ اس امر کا اظہار اسلامی اقتصادیات کے ماہرین میں سے ایک نمایاں شخصیت محمد اکرم خان کے اس مختصر مضمون سے بھی ہوتا ہے جو زیر نظر شمارے میں شامل ہے۔

جناب محمد اکرم خان صاحب کی شخصیت اور افکار سے قارئین "حکمت قرآن" بخوبی متعارف ہیں۔ اسلامی نظام معیشت سے متعلق ان کے گرانقدر مقالات گاہے بگاہے "حکمت قرآن" کی زینت بنتے رہے ہیں۔ ہمیں خوشی ہے کہ انہوں نے بھی اس بحث میں دلچسپی لیتے ہوئے اور اس مسئلے کی اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے ایک مفصل نوٹ ادارہ کو ارسال کیا ہے۔ موصوف کی رائے میں "دونوں اطراف کی رائے میں کچھ نہ کچھ کمزوری ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم مان لیں کہ یہ ان مسائل میں سے جو دور جدید میں پیدا ہوئے ہیں اور جن پر شرعی نقطہ نظر سے ابھی مزید تحقیق کی ضرورت ہے"۔ ہم جناب اکرم خان صاحب کی رائے سے اتفاق کرتے ہوئے ان سے گزارش کریں گے کہ وہ مسئلہ ہذا میں اپنی تحقیق اور مسئلہ کا حل بھی تجویز فرمائیں۔ اس لئے کہ یہ ایک بالکل بنیادی نوعیت کا معاملہ ہے اور ایک عام آدمی کے اعتبار سے اس کی عملی اہمیت بے پناہ ہے۔

اسلامی اقتصادی نظام پر باضابطہ انداز میں تحقیق کا آغاز ہوئے لگ بھگ بیس سال گزر چکے ہیں۔ یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ کرنسی کی شرعی حیثیت اور مالی لین دین میں اس کے حقیقی مقام پر تاحال کوئی اتفاق رائے نہیں ہو سکا۔ یہی وجہ ہے کہ اس میدان میں جب بھی کوئی محقق کسی معاملے میں تحقیق کرتا ہوا آگے نکل جاتا ہے اور کسی مقام پر پہنچ کر اسے اس قسم کے کسی معاملے کی طرف

(باقی صفحہ ۵۹ پر ملاحظہ فرمائیں)

سلسلہ تقاریر تعارف الکتاب

ڈاکٹر اسرار احمد

۱۸

قَدْ اَفْلَحَ

نَحْمَدُهٗ وَنُصَلِّی عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝ الَّذِیْنَ ھُمْ فِیْ صَلَاتِھِمْ خَاشِعُوْنَ ۝ وَالَّذِیْنَ ھُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ ۝ وَالَّذِیْنَ ھُمْ لِلزَّکٰوۃِ فَاعِلُوْنَ ۝ وَالَّذِیْنَ ھُمْ لِفُرُوْجِھِمْ حٰفِظُوْنَ ۝ اِلَّا عَلٰٓی اَزْوَاجِھِمْ اَوْ مَا مَلَکَتْ اَیْمَانُھُمْ فَاِنَّھُمْ غَیْرُ مَلُوْمِیْنَ ۝ (المؤمنون: ۱تا۶)

قرآن مجید کے اٹھارہویں پارے میں جو "قَدْ اَفْلَحَ" کے نام سے موسوم ہے دو سورتیں پوری پوری شامل ہیں یعنی سورۃ المومنون اور سورۃ النور۔ اور آخر میں ہیں ابتدائی آیات سورۃ الفرقان کی شامل ہیں۔

سورۃ المومنون اپنے مضامین کے اعتبار سے ان مکی سورتوں سے مشابہت رکھتی ہے، جن میں تفصیل کے ساتھ اللہ کے رسولوں اور ان کی اُمتوں کے حالات بیان ہوئے ہیں، خاص طور پر اس پہلو سے کہ جن قوموں کی طرف اللہ نے اپنے رسولوں کو مبعوث کیا، انہوں نے جب انکار اور کفر کی روش اختیار کی تو اللہ تعالیٰ نے انہیں ہلاک و نیست و نابود کر دیا۔ انبیاء و رسل کے اس ذکر میں ایک آیۂ مبارکہ بڑی عجیب وارد ہوئی ہے: وَاِنَّ ھٰذِہٖٓ اُمَّتُکُمْ اُمَّۃً وَّاحِدَۃً وَّاَنَا رَبُّکُمْ فَاتَّقُوْنِ ۝ (آیت ۵۲) نبیوں اور رسولوں سے مخاطب ہو کر اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ تم ایک ہی اُمت ہو، ایک ہی اُمتِ واحدہ کے افراد ہو اور میں تم سب کا رب، پروردگار، پالنہار اور خالق ہوں،

پس تم میرا ہی تقویٰ اختیار کرو۔ گویا یہ انبیاء کی وساطت سے اصل میں ان کی اُمتوں سے خطاب ہوا ہے کہ اگر کوئی حضرت مسیحؑ کا نام لیوا ہو یا کوئی اگر حضرت موسیٰؑ کا نام لیوا ہو، وہ یہ نہ سمجھے کہ یہ کوئی جداگانہ ملتیں تھیں یا جدا دین تھے۔ بلکہ یہ وہی دین ہے جو حضرت آدم علیہ السلام سے چلا آرہا ہے، اور جو بالآخر کامل ہوا ہے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر۔

سورۃ المومنون کے آغاز میں اہلِ ایمان کے کچھ اوصاف بیان ہوتے ہیں اور درحقیقت ان کے پردے میں یہ حقیقت کھل گئی ہے کہ انسان کے سیرت و کردار کی صحیح تعمیر یا علامہ اقبال کی اصطلاح میں تعمیرِ خودی کے لیے لازمی اساسات کیا ہیں؟ فرمایا:

قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُوْنَ ۝ (المومنون: ۱ تا ۴)

"کامیاب ہو گئے وہ اہلِ ایمان جو اپنی نمازوں میں خشوع اختیار کرتے ہیں، جو بیکار اور لغو باتوں سے کنارہ کش رہتے ہیں، جو تزکیۂ نفس پر کاربند رہتے ہیں اور اس کے لیے مسلسل کوشاں رہتے ہیں۔"

اس کے بعد فرمایا: جو اپنی خواہشِ نفس بالخصوص جنسی شہوت کو قابو میں رکھتے ہیں اور اس کی تسکین کے لیے کوئی ناجائز راستہ اختیار نہیں کرتے، جو اپنے عہد پر کاربند رہنے والے اور امانتوں کو ادا کرنے والے ہیں اور آخر میں پھر فرمایا: وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَوٰتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ ۝ (آیت ۹) "وہ جو کہ اپنی نمازوں کی محافظت کرنے والے ہیں۔"

ان اوصاف کی ابتداء اور انجام دونوں میں نماز کا ذکر کر کے اشارہ کر دیا گیا کہ تعمیرِ سیرت کا یہ پروگرام شروع بھی نماز سے ہوتا ہے اور اس کی معراج بھی نماز ہی ہے۔ جیسا کہ حضورؐ نے ارشاد فرمایا:

اَلصَّلٰوةُ مِعْرَاجُ الْمُؤْمِنِيْنَ (حدیث)

سورۃ المومنون کے اختتام پر بھی ایک بڑے ہی دلنشین پیرائے میں آخرت پر ایمان لانے کی دعوت دی گئی ہے: اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّاَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ ۝ (آیت ۱۱۵) کیا تم نے یہ گمان کیا ہے اے لوگو کہ ہم نے تمہیں بیکار اور عبث پیدا کیا ہے اور تم ہماری طرف واپس نہیں آؤ گے۔ تمہیں ہماری طرف واپس لوٹایا نہ جائے گا؟ یعنی اگر کسی کا یہ خیال ہے کہ زندگی بس یہی

زندگی ہے اور اس کے بعد کوئی زندگی نہیں اور زندگی کے اعمال کا کہیں کوئی نتیجہ نکلنے والا نہیں تو گویا وہ اس تخلیق کو عبث قرار دے رہا ہے۔ فَتَعٰلَی اللّٰہُ الْمَلِکُ الْحَقُّ۔ تو اللہ جو بادشاہ حقیقی ہے وہ تمہارے اس گمان سے بہت بلند و بالا اور اعلیٰ و ارفع ہے۔ اس کی حکمت سے یہ چیز کسی بھی طرح سے لگا نہیں کھاتی کہ وہ انسانوں کو بے مقصد اور بیکار پیدا کرے۔

اس کے بعد سورۃ النور آتی ہے۔ یہ قرآن مجید کی ایک عظیم سورۃ ہے جو نور کو عوں پر مشتمل اور اس کے عین وسط میں یعنی پانچواں رکوع آیاتِ نور پر مشتمل ہے۔ فرمایا گیا: اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (آیت ۳۵) "آسمانوں اور زمین کا نور اللہ ہے"۔ یعنی اللہ ہی کو پہچانو گے تو اس کائنات کی حقیقت بھی تم پر منکشف ہوگی اور خود اپنی عظمت سے بھی آگاہ ہو سکو گے۔ اللہ کا یہ نور بندۂ مومن کے قلب میں نورِ ایمان کی صورت میں جلوہ گر ہوتا ہے اور اس کی یہ تمثیل دی گئی کہ یہ نور، نورِ ایمان، نورِ فطرت، نورِ عقل سلیم اور نورِ وحی کے امتزاج سے وجود میں آتا ہے۔ "نورٌ علیٰ نور" جب نورِ فطرت پر نورِ وحی کا اضافہ ہو جاتا ہے تو یہ نور پر نور ہے، روشنی ہی روشنی ہے۔ اس کے بالمقابل برعکس کیفیت ہے ان لوگوں کی جو اس نورِ ایمان سے محروم ہیں، ان کی زندگیوں میں اگر کوئی خیر ہے بھی تو صرف دکھاوے کا خیر ہے، ریاکاری کی نیکی ہے جس کی اللہ کے ہاں کوئی قدر نہیں اور یا پھر وہ لوگ ہیں کہ جن کی کیفیت ہے: ظُلُمٰتٌ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ (آیت ۴۰) صرف نفس پرستی، مفاد پرستی یا یوں کہیے کہ خود پرستی ہی ان کی زندگی کا مقصود و مطلوب ہے۔ کوئی خیر، کوئی بھلائی، یہاں تک کہ جھوٹ موٹ کی نیکی کا کوئی ملمع بھی ان کی زندگی میں موجود نہیں ہے۔ یہ پانچواں رکوع حکمتِ قرآنی کا ایک اہم خزانہ ہے۔

اس سے پہلے اور اس سے بعد سورۃ النور میں بالخصوص مسلمانوں کی معاشرتی زندگی اور اسلام کا معاشرتی نظام بیان ہوا ہے کہ اسلامی معاشرہ ایک مخلوط معاشرہ نہیں ہے، اس میں مردوں اور عورتوں کا آزادانہ میل جول پسندیدہ نہیں ہے، سوائے اس کے کہ کوئی حقیقی ضرورت لاحق ہو، کوئی مجبوری پیدا ہو جائے۔ چنانچہ ستر کا حکم دیا گیا، حجاب کے احکام آئے، گھروں میں مردوں اور عورتوں کو جس طرح رہنا چاہیے اس کے تفصیلی احکام دیئے گئے۔ انہی چیزوں سے متعلق بعض واقعات بھی اس سورۂ مبارکہ میں آئے۔ چنانچہ واقعۂ افک بیان ہوا۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا پر عبداللہ بن اُبی رئیس المنافقین کی سازش سے جو تہمت لگی، جس میں بعض سادہ لوح مسلمان بھی شامل ہو گئے، اس کا تفصیل کے ساتھ ذکر ہوا،

اور اس کے ساتھ ہی اسلامی معاشرے کو فواحش اور بدکاری سے پاک کرنے کے لیے زنا کی حد بھی بیان ہوئی اور اگر کوئی کسی پر زنا کی جھوٹی تہمت لگا دے تو اس کی حد یا اس کی سزا یعنی حدِ قذف کا بیان بھی ہوا ساتھ ہی لعان کا قانون بھی بیان ہوا۔ الغرض معاشرتی زندگی کے متعدد پہلو ہیں جو اس سورۃ مبارکہ میں زیر بحث آئے ہیں۔ اور مسلمانوں کو تفصیلی احکامات دیئے گئے ہیں کہ تمہیں اپنی معاشرت کن اصولوں پر استوار کرنا ہے۔

سورۃ الفرقان کا آغاز ہوتا ہے اس عظیم آیت سے جس میں پھر حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبتِ عبدیت پر زور دیا گیا، تَبٰرَكَ الَّذِیْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰی عَبْدِهٖ لِیَكُوْنَ لِلْعٰلَمِیْنَ نَذِیْرًا ۝ بہت بابرکت ہے وہ ذات جس نے نازل فرمایا الفرقان یعنی وہ قرآن مجید جو حق اور باطل کے درمیان کھلا کھلا امتیاز کر دینے والا ہے اور نازل فرمایا اپنے بندے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اس لیے کہ: لِیَكُوْنَ لِلْعٰلَمِیْنَ نَذِیْرًا ۝ وہ خبردار کرنے والے بن جائیں، آگاہ کر دیں تمام جہان والوں کو حق بھی واضح کر دیں اور باطل بھی کھول کر بیان کر دیں، جو سچائی کا راستہ یعنی صراطِ مستقیم ہے اس کو بھی پوری طرح بیان فرما دیں اور واضح فرما دیں اور جو کجی کی پگڈنڈیاں ہیں ان سے بھی لوگوں کو خبردار کر دیں۔ اس سورۃ مبارکہ میں یہ مضمون بھی وارد ہوا کہ کفار یہ اعتراض کیا کرتے تھے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر کہ: مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ یَاْكُلُ الطَّعَامَ وَیَمْشِیْ فِی الْاَسْوَاقِ (آیت ۸) یہ کیسے رسول ہیں جو کھانا بھی کھاتے ہیں اور بازاروں میں بھی چلتے پھرتے ہیں، یعنی یہ تو عام انسانوں کی مانند ہیں۔ جواب دیا گیا، اے نبیؐ ان سے کہیے کہ ہم نے آپ سے پہلے جتنے نبی مبعوث کیے، جتنے رسول بھیجے وہ سب اسی طرح کھانا بھی کھاتے تھے اور بازاروں میں بھی چلتے پھرتے تھے، وہ بھی اسی طرح بشریت سے متصف تھے۔ انسانوں کی ہدایت کے لیے اللہ تعالیٰ کی سنت یہی رہی ہے کہ انسانوں کو مبعوث کیا جو ان ہی میں سے ہیں، جو انہی کی زبان بولتے ہوئے آئے اور جن کے ساتھ زندگی کے وہ تمام لوازم لگے ہوئے ہیں جو عام انسانوں کے ساتھ لگے ہوئے ہیں اور ان سب کے باوجود انہوں نے اپنی زندگی میں صداقت اور راستی، عدل و انصاف، حق پرستی، خدا کی بندگی، صراطِ مستقیم پر چلنے کا ایک کامل نمونہ پیش کر کے ابنائے نوع پر حجت قائم کر دی کہ اس دنیا میں رہتے ہوئے بھی اللہ کا بندہ بن کر رہنا ممکن ہے۔ اور اس کا بیّن ثبوت انبیاء کرام کی زندگیاں ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ان کے اتباع کی توفیق عطا فرمائے۔ واخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

درس ۳

حکمت قرآنی کی اساسات

سورۂ لقمان کے دوسرے رکوع کی روشنی میں

نَحمدہٗ ونُصلی علٰی رسولہِ الکریم
اعُوذ باللّٰہ من الشیطٰن الرجیم ○ بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

﴿وَلَقَدْ اٰتَیْنَا لُقْمَانَ الْحِکْمَۃَ اَنِ اشْکُرْ لِلّٰہِ ....اِنَّ اَنْکَرَ الْاَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِیْرِ○﴾ (آیات ۱۲-۱۹)

مطالعہ قرآن حکیم کے جس منتخب نصاب کی تشریح ان صفحات میں قسط وار شائع ہو رہی ہے اس کا پہلا درس سورۃ العصر پر اور دوسرا آیۂ بر پر مشتمل تھا۔ اب ہم اللہ کے نام سے اس سلسلے کے تیسرے درس کا آغاز کر رہے ہیں جو سورۂ لقمان کے دوسرے رکوع پر مشتمل ہے۔ سورۂ لقمان مصحف میں اکیسویں پارے میں شامل ہے اور اس کا دوسرا رکوع آٹھ آیات پر مشتمل ہے۔ تو آیئے اس کا ایک رواں ترجمہ سمجھ لیں تاکہ رکوع کے مضامین بیک وقت ہماری نگاہوں کے سامنے آجائیں۔

"اور ہم نے لقمان کو دانائی عطا فرمائی کہ شکر کر اللہ کا' اور جو کوئی شکر کرتا ہے تو وہ شکر کرتا ہے اپنے بھلے کو' اور جو کوئی کفرانِ نعمت کی روش اختیار کرتا ہے تو اللہ غنی ہے (بے نیاز ہے' اور وہ آپ ہی اپنی ذات میں محمود ہے) ستودہ صفات ہے۔ اور یاد کرو جب کہ لقمان نے کہا اپنے بیٹے سے اور وہ اسے نصیحت کر رہے تھے کہ اے میرے بچے! اللہ کے ساتھ شرک نہ کیجئو' یقیناً شرک بہت بڑا ظلم اور بہت بڑی ناانصافی ہے۔ اور ہم نے انسان کو وصیت کی ہے اس کے والدین کے بارے میں۔ اٹھائے رکھا

اسے اس کی والدہ نے کمزوری پر کمزوری جھیل کر' اور اس کا دودھ چھڑانا ہے دو سالوں میں' کہ کر شکر میرا اور اپنے والدین کا۔ میری ہی طرف لوٹنا ہے۔ اور اگر وہ تجھ سے جھگڑیں اس پر کہ تو میرے ساتھ شریک ٹھہرائے جس کے لئے تیرے پاس کوئی علم نہیں ہے تو ان کا کہنا مت مان اور دنیا میں ان کے ساتھ رہ معروف طور پر' اور پیروی کر اس کے راستے کی جس نے اپنا رخ میری طرف کر لیا ہو۔ پھر تم سب کو میری ہی طرف لوٹنا ہے اور میں تمہیں بتلا دوں گا جو کچھ تم کرتے رہے ہو۔ اے میرے بچے! خواہ وہ (یعنی نیکی یا بدی) رائی کے دانے کے ہم وزن ہو خواہ وہ کسی چٹان میں ہو' خواہ آسمانوں میں ہو' خواہ زمین میں ہو' اللہ اسے لے آئے گا۔ بے شک اللہ بہت باریک بین ہے' بہت باخبر ہے۔ اے میرے بچے! نماز قائم رکھ' نیکی اور بھلائی کا حکم دے' بدی اور برائی سے روک اور پھر صبر کر اس پر کہ جو تجھ پر بیتے۔ یقیناً یہ بڑے ہمت کے کاموں میں سے ہے۔ اور اپنی گردن کو ٹیڑھا نہ کر (کج رفی اختیار نہ کر) لوگوں کے لئے اور زمین میں اکڑ کر مت چل۔ اللہ کو مغرور لوگ اور شیخی خورے بالکل پسند نہیں۔ اپنی چال میں میانہ روی اختیار کر اور اپنی آواز کو پست رکھ' اس لئے کہ تمام آوازوں میں سب سے بڑھ کر ناپسندیدہ آواز گدھے کی آواز ہے۔"

اس ترجمہ سے جو باتیں بادنیٰ تامل سامنے آتی ہیں اور خاص طور پر اس منتخب نصاب کے اسباق کی ترتیب میں جن بنیادی امور کے پیش نظر اسے درس سوم کی حیثیت دی گئی ہے' مناسب ہے کہ سب سے پہلے انہیں سمجھنے کی کوشش کی جائے۔ اس طرح ہم ان شاء اللہ ان آیات کے اصل سبق اور ان کے لبِّ لباب کا جائزہ لے لیں گے۔

ترجمہ سے آپ نے محسوس کر لیا ہو گا کہ ان آیات میں بھی وہی چار باتیں ایک نئے اسلوب اور ترتیب سے بیان ہو رہی ہیں جو اس سے پہلے سورۃ العصر اور آیۂ بر میں آ چکی ہیں۔ اس لئے کہ اصل ہدایت اور صراطِ مستقیم تو ایک ہی ہے اور اس کے سنگ ہائے میل تو وہی ہیں۔ فرق بقول شاعر صرف یہ ہے کہ ع "اِک پھول کا مضموں ہو تو سو رنگ سے باندھوں"۔ گویا مختلف اسالیب اور متنوع انداز سے "راہِ ہدایت" کو واضح کرنا ہی قرآن کا اصل مقصد ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ ہر جگہ وہ بنیادی مضامین نہ صرف ایک نئے رنگ کے ساتھ آئے ہیں' بلکہ موضوع اور سیاق و سباق بھی بدلا ہوا ہے اور بحث بھی نئی ہے۔

توحید

ذرا جائزہ لیجئے' یہاں ایمانیاتِ ثلاثہ کے ضمن میں ایمان باللہ کا ذکر بڑی وضاحت کے ساتھ آیا ہے' مثبت انداز میں بھی اور منفی انداز میں بھی! ایمان باللہ کا مثبت پہلو یہ ہے کہ اللہ کا شکر کرو' اور ایمان باللہ کا منفی پہلو یہ ہے کہ اللہ کے ساتھ شرک نہ کرو۔ لہٰذا التزامِ شکرِ الٰہی اور اجتناب عن الشرک' یہ دونوں چیزیں اگر حاصل ہو جائیں تو گویا ایمان باللہ اور اس کی مطلوبہ کیفیات انسان کو بہ تمام و کمال حاصل ہو جائیں گی۔

رسالت

اس کے برعکس ایمان بالرسالت کا ذکر اس پورے رکوع میں آپ کو کہیں نہیں ملے گا۔ چنانچہ اس میں نہ کسی نبی کا ذکر ہے نہ کسی رسول کا' نہ وحی کا ذکر ہے نہ ملائکہ کا' اسی طرح کسی آسمانی کتاب کا بھی ذکر موجود نہیں ہے! اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں حکمت کی بنیادی باتیں' حکمتِ قرآنی کے بنیادی اصول ایک ایسی شخصیت کے حوالے سے بیان ہو رہے ہیں (یعنی حضرت لقمان) جو نہ نبی تھے' نہ رسول تھے' نہ ہی کسی نبی یا رسول کے امتی تھے۔ ان کے ذکر سے مقصود یہ ہے کہ اس حقیقت کو اجاگر کیا جائے کہ اگر انسان فطرتِ سلیمہ اور عقلِ صحیح کی رہنمائی میں ذہنی سفر طے کرے گا اور حقیقت کا جویا اور متلاشی ہو گا تو وہ از خود ایمان باللہ تک لازماً پہنچ جائے گا۔ لہٰذا یہاں نبوت و رسالت کا سرے سے کوئی ذکر نہیں ہے۔

معاد

البتہ ایمان بالآخرۃ جس کا اصل جوہر اور اصل مآل جزائے اعمال یا مکافاتِ عمل ہے' یعنی یہ کہ انسان کے اعمال و افعال بے نتیجہ نہیں رہیں گے بلکہ نیکی اور بدی کا بھرپور بدلہ مل کر رہے گا' تو اس کا ذکر یہاں نہایت بلیغ پیرائے میں موجود ہے۔ چنانچہ حضرت لقمان نے اپنے بیٹے کو جو نصائح کیں ان میں سے ایک اہم نصیحت یہ ہے کہ

﴿ يٰبُنَيَّ اِنَّهَآ اِنْ تَكُ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ فَتَكُنْ فِي

صَخْرَةٍ اَوْ فِی السَّمٰوٰتِ اَوْ فِی الْاَرْضِ یَاْتِ بِهَا اللّٰهُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَطِیْفٌ خَبِیْرٌ ۝ (آیت ۱۶)

"اے میرے بچے! نیکی یا بدی خواہ رائی کے دانے کے برابر ہو اور پھر خواہ کسی چٹان میں چھپ کر کی گئی ہو' خواہ فضا کی پہنائیوں میں' خواہ زمین کے پیٹ میں گھس کر (وہ ضائع نہیں ہو گی) اللہ اس کو لے آئے گا۔ بے شک اللہ بہت باریک بین' بہت باخبر ہے۔"

یہی اصل میں ایمان بالآخرۃ کا لبِّ لباب ہے کہ ع "از مکافاتِ عمل غافل مشو!" اعمال کا نتیجہ نکل کر رہے گا۔ لیکن دیکھ لیجئے کہ یہاں یوم آخر' یوم القیامہ' جزا و سزا اور جنت و دوزخ کا ذکر صراحت کے ساتھ موجود نہیں ہے۔ اس لئے کہ یہ امور وہ ہیں جو صرف نبوت و رسالت کے ذریعے سے معلوم ہو سکتے ہیں۔ گویا یہاں ایمان بالآخرۃ کا بھی وہی پہلو مذکور ہے جس کا تعلق حکمت و دانائی سے ہے اور جس تک رسائی وحی' نبوت اور رسالت کے بغیر بھی صرف فطرتِ صحیحہ اور عقلِ سلیم کی رہنمائی میں ہو سکتی ہے!

حکمت کی اساس

واقعہ یہ ہے کہ حکمت کی اصل اساس یہ ہے کہ قلبِ انسانی میں خالق اور رب کی جو معرفت ودیعت شدہ لیکن خوابیدہ حالت میں ہے انسان اس کی جوت کو اپنے قلب و ذہن میں جگا لے۔ گویا فطرت کی صحت اور فکر کی سلامتی کا لازمی نتیجہ "شکر" ہے۔ اور سلامتیٔ عقل اور درستیٔ فکر و نظر کا حاصل یہ ہے کہ انسان اپنے پروردگار حقیقی کو پہچان لے۔ بالفاظِ دیگر حکمت کا لازمی تقاضا ہے کہ یہ جذبہ شکر اپنے اصل مالک' آقا' پالن ہار اور پروردگار کی ذات پر مرتکز ہو جائے۔ پھر یہی شکرِ الٰہی اس امر کو مستلزم ہے کہ ایسا انسان شرک سے بالکلیہ اجتناب اور توحید کا التزام کرے۔ لہٰذا لقمان حکیم نے' جن کو اللہ تعالیٰ نے دانائی اور حکمت عطا کی تھی' اپنی فطرتِ صحیحہ اور عقل سلیم کی روشنی میں "توحید" کی معرفت اور جذبۂ شکر سے سرشار ہونے کی سعادت حاصل کی۔ اسی لئے وہ اپنے بیٹے کو نہایت ہی دل نشین اور پیار بھرے انداز میں نصیحت کرتے ہیں کہ :

﴿ یٰبُنَیَّ لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ ؕ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِیْمٌ ۝ ﴾

(آیت ۱۳)

"اے میرے پیارے بچے! دیکھنا کہیں اللہ کے ساتھ (اس کی ذات وصفات میں) کسی کو شریک نہ ٹھہرالینا۔ یقیناً شرک بہت بڑا ظلم اور بہت بڑی ناانصافی ہے"۔

ادائے حقوق

ہم نے دیکھا تھا کہ سورۃ العصر اور آیۂ بر میں ایمان کے بعد اعمال صالحہ کا ذکر ہے۔ یہاں ان کے ضمن میں سب سے پہلی جو چیز سامنے آئی ہے وہ ادائے حقوق ہے اور ان میں بھی اولین ذکر والدین کے حقوق کا ہے۔ قرآن حکیم میں آپ کو کئی مقامات پر یہ اسلوب ملے گا کہ ادائے حقوق کے معاملے میں جہاں اللہ تعالیٰ کے اس حق کا تذکرہ ہو گا کہ صرف اور صرف اس کی عبادت کی جائے' شرک سے کلی اجتناب اور توحید کے کامل التزام کے ساتھ' وہاں اللہ کے اس حق کے فوراً بعد والدین کے حقوق کا بیان ہو گا۔ جیسے یہاں ہم نے دیکھا کہ حضرت لقمان کی اپنے بیٹے کو اجتناب شرک اور التزام توحید کی نصیحت کے ذکر کے بعد اللہ تعالیٰ کی طرف سے فرمایا جارہا ہے کہ

﴿وَوَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ.....﴾ (آیت ۱۴)

"اور ہم نے انسان کو نصیحت کی اس کے والدین کے بارے میں....."

اسی طرح سورۃ البقرۃ میں فرمایا :

﴿وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَ بَنِي إِسْرَاءِيلَ لَا تَعْبُدُونَ إِلَّا اللّٰهَ وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا.....﴾ (آیت ۸۳)

"اور یاد کرو جب ہم نے بنی اسرائیل سے پختہ عہد لیا تھا کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرنا اور والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کرنا۔"

اسی طرح سورۃ الانعام میں فرمایا :

﴿قُلْ تَعَالَوْا أَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ أَلَّا تُشْرِكُوا بِهٖ شَيْئًا وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا﴾ (آیت ۱۵۲)

"(اے نبی) ان سے کہہ دیجئے کہ آؤ میں تمہیں سناؤں کہ تمہارے رب نے تم پر کیا پابندیاں عائد کی ہیں! یہ کہ اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ اور والدین کے ساتھ نیک سلوک کرو"۔

سورۂ بنی اسرائیل میں فرمایا :

﴿وَقَضٰی رَبُّکَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِیَّاہُ وَبِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا﴾ (آیت ۲۳)

"اور تیرے رب نے فیصلہ کر دیا ہے کہ تم لوگ کسی کی عبادت نہ کرو مگر صرف اس کی اور والدین کے ساتھ نیک سلوک کرو"۔

والدہ کا خصوصی حق

اس رکوع میں جس کا ہم مطالعہ کر رہے ہیں' والدین کے حقوق کا ذکر کر کے والدہ کے حق کو نمایاں کیا گیا اور اپنے شکر کے ساتھ والدین کے شکر کی تاکید فرمائی گئی :

﴿وَوَصَّیْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَیْہِ' حَمَلَتْہُ اُمُّہٗ وَہْنًا عَلٰی وَہْنٍ وَّفِصَالُہٗ فِیْ عَامَیْنِ اَنِ اشْکُرْ لِیْ وَلِوَالِدَیْکَ﴾

"اور ہم نے انسان کو وصیت کی اس کے والدین کے بارے میں۔ اٹھائے رکھا اسے اس کی والدہ نے کمزوری پر کمزوری جھیل کر اور اس کا دودھ چھڑانا ہے دو سالوں میں' کہ کر شکر میرا اور اپنے والدین کا۔"

والدین کے ساتھ حسن سلوک اصل میں ایک جامع عنوان ہے اس بات کا کہ اس دنیا میں انسان زندگی بسر کرتا ہے تو اس پر بہت سے لوگوں کے حقوق عائد ہو جاتے ہیں جنہیں اسے ادا کرنے کی فکر کرنی چاہئے۔ انہیں شریعت کی اصطلاح میں "حقوق العباد" کہا جاتا ہے اور ان میں سرفہرست والدین کے حقوق ہیں' اس میں قطعاً کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔ انسان پر سب سے بڑا احسان تو بلاشک و بلاریب اللہ تعالیٰ کا ہے جو اس کا خالق ہے' مالک ہے اور پروردگار حقیقی ہے۔ لیکن اللہ کے بعد انسان سب سے زیادہ زیر بار احسان ہے اپنے والدین کا جنہوں نے اسے پالا پوسا' اپنا پیٹ کاٹ کر اسے کھلایا پلایا' اپنے آرام کو تج کر اس کے آرام کی فکر کی' اس کی تکلیف پر بے چین ہوتے رہے۔ پھر ان میں بالخصوص والدہ کا حق بہت فائق ہے۔ لہٰذا والدین کے ذکر کے بعد یہاں والدہ کا خاص طور پر ذکر آیا ہے' جس نے اسے ضعف پر ضعف برداشت کرتے ہوئے اپنے پیٹ میں اٹھائے رکھا۔ پیدائش کے بعد پھر وہ دو سال تک جونک کی طرح اس کی چھاتی سے چمٹ کر دودھ کی شکل میں اس کے

جسم و جان کی توانائیاں چوستا رہا اور اس نے اپنی توانائیوں کو بہترین غذا بنا کر اس کے جسم میں اتارا' لہٰذا والدین بالخصوص والدہ کے اولاد پر یہ احسانات نہایت عظیم ہیں۔ چنانچہ انسانوں کے حقوق میں سرفہرست والدین کے حقوق ہیں۔ یہاں والدہ کے حقوق کے فائق ہونے کے ضمن میں دو مشہور احادیث کا ذکر مناسب رہے گا۔

ایک یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ "جنت ماں کے قدموں تلے ہے" یعنی ماں کی خدمت اور اس کے ساتھ حسن سلوک انسان کے جنت میں داخل ہونے کے ذرائع میں سے ایک اہم ذریعہ ہے۔ دوسرے یہ کہ ایک مرتبہ ایک صحابیؓ نے حضورؐ سے دریافت کیا کہ "میرے حسن سلوک کا سب زیادہ مستحق کون ہے؟" تو حضورؐ نے فرمایا "تیری ماں"۔ صحابی نے پھر پوچھا "اس کے بعد؟" جواب ملا "تیری ماں"۔ صحابیؓ نے تیسری مرتبہ دریافت کیا "اس کے بعد؟" آپؐ نے پھر فرمایا "تیری ماں"۔ چوتھی مرتبہ صحابی کے سوال کے جواب میں ارشاد ہوا: "تیرا باپ"۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ باپ کے مقابلے میں ماں کا حق تین گنا فائق ہے۔

ایک لطیف نکتہ

یہاں ایک نکتہ قابل توجہ ہے اور وہ یہ کہ حضرت لقمان نے وصیت کرتے ہوئے بیٹے کو اللہ کا حق تو بتا دیا کہ "اے میرے بچے! اللہ کے ساتھ شرک مت کرنا" لیکن خود اپنے حقوق کو بیان کرنا انہیں زیب نہ دیتا تھا۔ لہٰذا اس مضمون کی تکمیل اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف سے فرما دی اور حضرت لقمان کی نصیحتوں کے سلسلے میں ایک بات اپنی طرف سے داخل فرما دی جو والدین کے حقوق سے متعلق ہے۔ البتہ اس کے نتیجے میں ایک سوال خود بخود پیدا ہو گیا' یعنی یہ کہ اگر دونوں حقوق ایک دوسرے کے مقابل آ جائیں' اور باہم ٹکرا جائیں یعنی ایک اللہ کا حق' دوسرے مخلوقات میں سے سب سے فائق والدین کا حق' اور خود والدین اپنی اولاد کو شرک پر مجبور کریں تو اس صورت میں اولاد کیا کرے؟---- یہ ایک بالکل عملی مسئلہ ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر جو لوگ ابتدا ہی میں ایمان لائے ان میں متعدد نوجوان بھی تھے۔ ان میں سے دو نوجوانوں حضرت سعد بن ابی وقاص اور حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہما کا ذکر بہت مناسب ہے۔ ان کے لئے سب سے بڑا عملی مسئلہ یہ کھڑا ہو

گیا کہ ان دونوں کی والدہ مشرک تھیں۔ وہ انہیں اپنے حقوق کا واسطہ دے کر مجبور کر رہی تھیں کہ اپنے آبائی دین کو ترک نہ کرو' اس میں واپس آ جاؤ۔ ان نوجوانوں کی ماؤں نے بھوک ہڑتال اور مرن برت تک کی دھمکیاں دیں۔ اب ان سعادت مند' سلیم الفطرت اور صحیح العقل نوجوانوں کے سامنے یہ عملی سوال آیا کہ اب کیا کریں؟---- ظاہر بات ہے کہ سعادت مند اولاد کو فطری طور پر ماں باپ کے حقوق کا شعور ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے ان کے لئے ایک عملی پیچیدگی پیدا ہو گئی۔ قرآن مجید نے اسی سیاق و سباق میں آگے اس کا حل پیش کر دیا :

﴿ وَاِنْ جَاهَدٰكَ عَلٰٓى اَنْ تُشْرِكَ بِىْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا ﴾

"اور اگر وہ تجھ سے جھگڑیں اس بات پر کہ تو میرے ساتھ شریک ٹھہرائے جس کے لئے تیرے پاس کوئی علم نہیں ہے تو ان کا کہنا مت مان۔"

البتہ یہ نہیں فرمایا کہ اس طرح ان کے سارے حقوق ساقط ہو گئے۔ ایسا معاملہ نہیں ہے۔ شرک پر مجبور کرنے کے ضمن میں تو ان کی حکم عدولی کی جائے گی لیکن ان کے ساتھ حسنِ سلوک کا حکم باقی اور برقرار رہے گا۔ چنانچہ فرمایا :

﴿ وَصَاحِبْهُمَا فِى الدُّنْيَا مَعْرُوْفًا ﴾

"اور دنیا میں ان کے ساتھ رہ معروف طور پر (یعنی بھلے طریقے سے)۔"

لیکن اس کے ساتھ ہی بارِ دگر تنبیہ کر دی گئی کہ حسن سلوک میں اتباع یعنی پیروی شامل نہیں ہے۔ پیروی صرف اس شخص کی کی جائے گی جس نے اپنا رخ اللہ کی طرف کر لیا ہو! چنانچہ فوراً ہی ارشاد ہوا :

﴿ وَاتَّبِعْ سَبِيْلَ مَنْ اَنَابَ اِلَىَّ ﴾

"دیکھنا اتباع کرنا اس کا جس نے اپنا رخ میری طرف کر رکھا ہو۔"

مشرک والدین کا اتباع یا ان کے نقش قدم کی پیروی نہ عقلاً لازم ہے نہ نقلاً واجب!

نگاہ بازگشت

الحمد للہ کہ ہم نے اب تک اس رکوع کے نصف اول یعنی چار آیات کا طائرانہ جائزہ

لے لیا ہے۔ آگے بڑھنے سے پہلے آیئے کہ ان کے مضامین پر نگاہ باز گشت ڈال لیں۔ اس کی پہلی آیت میں حضرت لقمان کا تعارفی ذکر ہے۔ دوسری آیت میں ان کی نصائح کا آغاز ہوا جن میں سے اولین اور اہم ترین نصیحت اجتناب عن الشرک کی پر زور تاکید پر مشتمل تھی۔ بعد کی دو آیات میں اللہ تعالیٰ نے اس وصیت کا اپنی جانب سے ذکر فرمادیا جو جبلی طور پر بھی انسان کی طبیعت میں ودیعت کی گئی ہے اور اس کی توثیق الہام اور وحی کے ذریعے بھی ہوئی۔ پھر اگر حقوق اللہ اور حقوق الوالدین میں ٹکراؤ ہو تو ایک موحّد کو کیا رویہ اختیار کرنا چاہئے اس کی ہدایت کر دی گئی۔ اس کے بعد سے پھر حضرت لقمان کی نصائح کا ذکر شروع ہوا جس میں دوسری نصیحت مکافاتِ عمل یعنی معاد سے متعلق ہے' اس کے بعد رکوع کے اختتام تک حضرت لقمان کی چند عملی نصیحتوں کا ذکر چلتا ہے۔

البتہ سورۃ العصر اور آیۃ البر کے مضامین کے ساتھ تقابل اور موازنہ کے حوالے سے بہتر ہو گا کہ مضمون مکمل ہو جائے اور چند اشارات کر دیئے جائیں۔ آپ نے دیکھا کہ سورۃ العصر میں ایمان کی جامع اصطلاح اور آیۃ البر میں ایمانیات کی قدرے تفصیل مذکور تھی۔ اس کے مقابلے میں یہاں ایمان باللہ کا ذکر اللہ کے شکر اور اجتناب عن الشرک کی تاکید کی شکل میں آگیا اور ایمان بالآخرۃ کا ذکر مکافاتِ عمل کے حوالے سے بیان ہو گیا۔ پھر عمل صالح کے ضمن میں بھی سورۃ العصر میں صرف ایک جامع عنوان وارد ہوا تھا جبکہ آیۂ بر میں عمل صالح کے تین اہم گوشوں کی تفصیل مذکور تھی۔ بعینہٖ یہی معاملہ یہاں بھی ہے حتیٰ کہ جیسے آیۂ بر میں انسانی ہمدردی کا ذکر مقدم تھا اقامتِ صلوٰۃ پر' یہاں بھی والدین کے حقوق کا ذکر پہلے آیا ہے اور صلوٰۃ کا ذکر بعد میں۔ اس کے بعد یہاں آپ مزید اعمال صالحہ شمار کریں گے تو آخری دو آیات میں تواضع' انکساری اور فروتنی کا معاملہ آئے گا۔ "صعر" اونٹ کی گردن کی ایک بیماری کو کہا جاتا ہے جس سے اس کی گردن ٹیڑھی ہو جاتی ہے۔ انسانوں میں جب تمکنت پیدا ہو جاتی ہے تو غرور کی وجہ سے چال میں اکڑ' انداز گفتگو میں بے اعتنائی اور کج ادائی آجاتی ہے۔ حضرت لقمان کی نصائح کے ذریعے سے ان چیزوں سے روکا گیا' اس حوالے سے کہ اللہ تعالیٰ مغرور اور اترانے والے لوگوں کو بالکل پسند نہیں کرتا۔ مزید برآں عملی زندگی میں ہر اعتبار سے اعتدال اور توازن کی تاکید کی گئی۔

سورۃ العصر میں تیسری چیز تھی تواصی بالحق۔ یہاں اس کے ضمن میں ایک معین اصطلاح آگئی ہے، یعنی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر، چنانچہ اقامتِ صلوٰۃ کے تاکیدی حکم کے معاً بعد ارشاد ہوتا ہے :

﴿وَأْمُرْ بِالْمَعْرُوفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنكَرِ﴾

"نیکی کا حکم دو اور بدی سے روکو۔"

امر بالمعروف ہمارے دین کی بڑی اہم اصطلاح ہے۔ اتنی اہم کہ امّتِ مسلمہ کا مقصدِ تاسیس ہی اللہ تعالیٰ نے سورۂ آل عمران میں اسی اصطلاح کے حوالے سے بیان کیا ہے کہ

﴿كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ﴾ (آیت ۱۱۰)

"(اے مسلمانو!) تم وہ بہترین امت ہو جسے دنیا والوں کے لئے برپا کیا گیا ہے۔ تمہاری ذمہ داری ہے کہ نیکی کا حکم دو، بدی سے روکو اور اللہ پر پختہ ایمان رکھو۔"

سورۃ العصر میں آخری چیز تھی تواصی بالصبر۔ یہاں حضرت لقمان کی نصیحتوں میں اس کا بیان آگیا۔ آں جناب اپنے بیٹے سے کہتے ہیں کہ

﴿وَاصْبِرْ عَلَىٰ مَا أَصَابَكَ ۖ إِنَّ ذَٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْأُمُورِ﴾

(آیت ۱۷)

"اور صبر کر ان مصائب پر جو (بالخصوص امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دینے پر) تجھے درپیش ہوں۔ یقیناً یہ (امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضے کی ادائیگی) بڑے ہمت اور حوصلے کے کاموں میں سے ہے۔"

نیکی کا حکم، نیکی کی تلقین اور بدی سے روکنا، اس پر نکیر کو عام طور پر ٹھنڈے پیٹوں برداشت نہیں کیا جاتا۔ لہٰذا تمسخر و استہزاء، تضحیک و توہین، مصائب و شدائد اور ابتلاء و امتحان اس راہ کے لوازم میں سے ہیں۔ ان کو جھیلنا اور برداشت کرنا ہوگا۔

یہ ہے اس رکوع کے مضامین کا خلاصہ جو بادنیٰ تأمل ہمارے سامنے آگیا۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں بھی حکمت و دانائی کا وافر حصہ عطا فرمائے اور یہ حکمت و دانائی محض ذہن و فکر کی حد تک محدود نہ رہے بلکہ ہماری سیرت و کردار اور اخلاق و معاملات میں رچ بس

جائے اور ہماری شخصیت کا ایک جزوِ لاینفک بن جائے۔ آمین یا رب العالمین!

آیاتِ مبارکہ کا بطریق تدبّر مطالعہ

قارئین کرام کو یاد ہو گا کہ سلسلہ درس کے بالکل آغاز میں یہ عرض کیا گیا تھا کہ فہم قرآن کے دو درجے ہیں۔ ایک تذکر بالقرآن' یعنی آیات اور سورتوں کے مطالعے سے ان کا اصل سبق اور ان کا لب لباب حاصل کر لیا جائے' گویا بنیادی ہدایت اخذ کر لی جائے' دوسرا تدبر قرآن' یعنی قرآن مجید کی آیات اور سورتوں کی گہرائیوں میں غوطہ زنی کی جائے' ایک ایک لفظ پر تدبر و تفکر کا حق ادا کیا جائے' آیات کے باہمی ربط اور سورتوں کے داخلی اور خارجی نظم کا فہم حاصل کرنے کی کوشش کی جائے۔ ہم نے سورۂ لقمان کے دوسرے رکوع پر بطریق تذکر اختصار کے مدنظر جس حد تک ممکن ہو سکا وہ اساسی رہنمائی اخذ کر لی ہے جو اس رکوع کے اصل سبق سے متعلق ہے۔ اب ہمیں اس رکوع پر بطریقِ تدبّر غور کرنا ہے۔

یہ رکوع اس اعتبار سے بہت اہم ہے کہ اس میں حکمتِ قرآنی کی اساسات متعین ہوتی ہیں۔ "حکمت" کا لفظ اردو میں مستعمل ہے اور بالعموم اس کو ہم فلسفہ کے ساتھ جوڑ کر استعمال کرتے ہیں یعنی فلسفہ و حکمت' لیکن یہ بات سمجھنا بہت ضروری ہے کہ فلسفہ اور حکمت میں ایک بڑا بنیادی فرق ہے۔ فلسفے کا دارومدار خالصتاً عقل پر ہے۔ چنانچہ فلسفہ منطق کے اصولوں پر آگے بڑھتا ہے جبکہ حکمت کی اصل اساس بدیہیاتِ فطرت پر ہے اور اس عمارت کی تعمیر فطرت کے مسلّمات کی بنیاد پر ہوتی ہے' اگرچہ عقل سلیم اسے ایک ہنرمند معمار کی طرح اوپر اٹھاتی ہے' بالکل ایسے جیسے قرآن حکیم میں کلمۂ طیبہ اور عملِ صالح کے باہمی ربط و تعلق کو واضح کیا گیا کہ :

﴿اِلَیۡہِ یَصۡعَدُ الۡکَلِمُ الطَّیِّبُ وَالۡعَمَلُ الصَّالِحُ یَرۡفَعُہٗ﴾

(فاطر ۱۰)

"اسی کی جانب بلند ہوتے ہیں کلماتِ طیبات اور عمل صالح انہیں اوپر اٹھاتا ہے!"

واضح رہے کہ ہماری فطرت میں کچھ حقائق مضمر ہیں جنہیں ہم اپنے شعور کی تحتانی سطح پر

محسوس کرتے ہیں اور چاہے ہم ان کے لئے کوئی دلیل نہ دے سکیں لیکن فطرت کے ان مضمر حقائق کا ہم نہ انکار کر سکتے ہیں نہ ابطال۔ ان بدیہیات فطرت کو بنیاد بنا کر جب تعقل و تفکر کا عمل آگے بڑھے تو اس طرح جو دولتِ عظمیٰ حاصل ہو گی وہ "حکمت" ہے۔ ذرا اس لفظ حکمت کو بھی اچھی طرح سمجھ لیجئے۔ عربی زبان میں "ح ک م" کے مادے سے جو الفاظ بنتے ہیں ان سب میں آپ کو کسی شے کی پختگی اور مضبوطی کا مفہوم مشترک ملے گا۔ چنانچہ اسی سے لفظ استحکام بنا ہے جسے عام طور پر ہمارے یہاں استعمال کیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ فلاں چیز مستحکم ہے یعنی بہت پختہ اور مضبوط ہے۔ "حکمت" اصل میں انسان کی عقل و شعور کی وہ پختگی ہے کہ جس سے اس میں اصابتِ رائے پیدا ہو جائے' اس میں صحیح نتائج اخذ کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جائے' اس میں صحیح و غلط میں فرق و امتیاز کرنے کی اہلیت پیدا ہو جائے اور اسے صحیح حقائق تک رسائی حاصل ہو جائے۔ ان تمام اوصاف کو جمع کریں تو انسان میں جو قابلیت اور صلاحیت پیدا ہو گی وہ "حکمت" ہے۔ قرآن مجید میں سورۃ البقرہ (آیت ۲۶۹) میں "حکمت" کو اللہ تعالیٰ نے اپنا ایک بہت بڑا انعام و احسان اور بہت بڑا فضل قرار دیا ہے' چنانچہ ارشاد ہوا :

﴿يُؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَّشَاءُ﴾

"اللہ تعالیٰ حکمت عطا فرماتا ہے جس کو چاہتا ہے۔"

اور

﴿وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا﴾

"جسے حکمت عطا ہو گئی اسے تو خیر کثیر عطا ہو گیا۔"

گویا اسے نہایت قیمتی اور کمیاب شے مل گئی۔ چنانچہ ہمارے دین کی ایک اعلیٰ قدر حکمت ہے۔ یعنی عقل و شعور کی پختگی' دانائی' حقائق رسی کی صلاحیت' اصابتِ رائے' نیکی اور بدی میں تمیز کرنے کی اہلیت اور خیر و شر میں فرق کرنے کی قابلیت۔ جس کو اللہ تعالیٰ یہ سب کچھ عطا فرما دے اس پر اللہ تعالیٰ کے انعام' احسان اور فضل کا کیا کہنا! اس موقع پر مناسب ہے کہ حکمت کے ضمن میں نبی اکرم ﷺ کی ایک حدیث بھی بیان کر دی جائے۔ آنحضور ﷺ فرماتے ہیں :

((اَلْحِکْمَۃُ ضَالَّۃُ الْمُؤْمِنِ' فَحَیْثُ وَجَدَھَا ھُوَ اَحَقُّ بِھَا))

"حکمت اور دانائی مومن ہی کی گمشدہ متاع کے مانند ہے' وہ اس کا سب سے زیادہ حق دار ہے جہاں کہیں بھی اسے پائے۔"

یعنی جیسے ہماری کوئی چیز کہیں کھو گئی ہو اور پھر وہ ہمیں کہیں نظر آئے تو ہم اس کی طرف لپکتے ہیں کہ یہ میری چیز ہے۔ اس فعل میں ہمیں کوئی رکاوٹ اور کوئی جھجک نہیں ہوتی۔ بالکل اسی نوعیت کا معاملہ مومن کا ہے کہ حکمت و دانائی اسے جہاں بھی نظر آئے گی وہ اسے لپک کر قبول کرلے گا' بالکل اسی طرح جس طرح کوئی شخص اپنی کسی گم شدہ چیز کو حاصل کرنے کے لئے لپکتا ہے۔ بلکہ حضور ﷺ کا ارشاد تو یہ ہے کہ مومن حکمت کا سب سے زیادہ مستحق ہے۔

حکمتِ قرآنی کی اساس اول : شکرِ خداوندی

سورۂ لقمان کے اس رکوع میں حضرت لقمان کی شخصیت کے حوالے سے گفتگو شروع ہوئی لیکن حکمتِ قرآنی کی دو اساسات کو متعین کر دیا گیا۔ پہلی اساس ہے شکرِ خداوندی۔ یہاں مناسب ہو گا کہ لفظ "شکر" کو بھی اچھی طرح سمجھ لیا جائے۔ اگرچہ یہ لفظ اردو میں مستعمل ہے لیکن اگر کسی سے پوچھا جائے کہ شکر کسے کہتے ہیں' اس کے معنی کیا ہیں! تو جواب ملے گا کہ شکر' شکر ہوتا ہے۔ اس کے لئے اکثر لوگ شاید کوئی دوسرا لفظ استعمال نہ کر سکیں۔ شکر کیا ہے! اس کی امام راغب اصفہانیؒ نے بڑی عمدہ تشریح فرمائی ہے۔ وہ کہتے ہیں "شکر کے معنی ہیں کسی احسان و انعام کا ادراک و تصور اور اس کا اظہار و اعتراف"۔ اس کے برعکس جو کیفیت ہے وہ "کفر" ہے۔ اس رکوع کی پہلی آیت میں فرمایا گیا :

﴿وَمَنْ یَّشْکُرْ فَاِنَّمَا یَشْکُرُ لِنَفْسِہٖ' وَمَنْ کَفَرَ فَاِنَّ اللّٰہَ غَنِیٌّ حَمِیْدٌ ۝﴾ (آیت ۱۲)

"اور جو شکر کرتا ہے اپنے بھلے کے لئے کرتا ہے اور جس نے کفر کیا تو بلاشبہ اللہ بے نیاز ہے اور اپنی ذات میں ستودہ صفات (اور از خود محمود) ہے۔"

عام طور پر کفر کے معنی صرف انکار کے سمجھے جاتے ہیں۔ جیسے کوئی دین کی کسی بنیادی بات کا انکار کرے' توحید کا منکر ہو یا اللہ کی صفات کمال کا منکر ہو' اسی طرح رسالت کا منکر ہو یا ختم نبوت کا منکر ہو' آخرت کا منکر ہو یا جنت اور دوزخ کا منکر ہو تو ایسا شخص کافر ہے۔ یہ بات اپنی جگہ صد فیصد صحیح ہے لیکن لغوی اعتبار سے اصل میں کفر' شکر کی ضد ہے۔ یہ دونوں الفاظ "شکر و کفر" متضاد معنی کے حامل (Antonyms) ہیں۔ شکر کیا ہے! یہ کہ انسان کو نعمت کا احساس ہو اور وہ اس کا اظہار کرے۔ اور کفر کے معنی ہیں چھپا دینا' دبا دینا' لہٰذا جب یہ شکر کے مقابلے میں آئے گا تو اس کا مفہوم ہو گا ناشکرا پن یا کفرانِ نعمت۔

آپ تھوڑے سے غور سے اس نتیجہ تک خود پہنچ جائیں گے کہ شکر فطرت کا جزوِ لاینفک ہے' بشرطیکہ فطرت صحیح ہو اور مسخ نہ ہوئی ہو۔ یہ بات اس حد تک درست ہے کہ یہ معاملہ صرف انسانوں تک محدود نہیں بلکہ حیوانات تک میں پایا جاتا ہے۔ چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ اگر کوئی بھوکا پیاسا جانور ہو' آپ نے اس کے سامنے چارہ یا پانی رکھ دیا اور اس نے اپنی بھوک یا پیاس مٹائی تو اب وہ گردن اٹھا کر جب آپ کو دیکھے گا تو آپ کو اس کی آنکھوں میں جذبۂ تشکر چھلکتا ہوا نظر آئے گا۔ یہ فطرت ہے اور اچھی طرح جان لیجئے کہ فطرت کی صحت کی علامت یہ ہے کہ انسان میں شکر کا جذبہ موجود ہو۔ اگر یہ کیفیت ختم ہو جائے تو ایسا شخص ایک ناشکرا انسان ہو گا کہ اس کے ساتھ بھلائی کی جا رہی ہو اور اسے احساس بھی نہ ہو کہ کسی نے اس کے ساتھ بھلائی کی ہے۔ اسے شعور تک نہ ہو کہ کسی نے اس کے ساتھ احسان اور حسن سلوک کا معاملہ کیا ہے۔ ایسے شخص کے لئے حکم لگایا جائے گا کہ اس کی فطرت مسخ ہو چکی ہے یا بالفاظ دیگر اس کی فطرت کے سوتے خشک ہو چکے ہیں۔ عرب ابلتے چشمے کو "العَین الشکرٰی" کہتے ہیں۔ یعنی وہ چشمہ جس سے پانی ابل رہا ہے۔ پھر "دَابَّۃٌ شَکُوْر" اس جانور اور اس حیوان کو کہتے ہیں کہ اگر اس کی مثل سیوا کی جائے' اچھا کھانے پینے کو دیا جائے تو وہ فربہ ہوتا ہے۔ اس دیکھ بھال اور اچھی غذا کا اس کے وجود میں ظہور ہوتا ہے تو اسے وہ دَابَّۃٌ شَکُوْرٌ کہتے ہیں۔ لہٰذا شکر فطرت کے اس جذبے کو کہتے ہیں جو کسی نعمت اور کسی احسان پر انسان کے باطن سے ابھرتا ہے۔ اب اس فطری اساس پر عقل سلیم کے ذریعے اضافی تعمیر ہو گی۔ عقل کا وظیفہ کیا ہے؟ یہ کہ وہ اپنے محسن

حقیقی کو پہچانے اور اس طرح اس کے شکر اور احسان مندی کے جذبے سے اس کا ذہن و قلب سرشار ہو جائے۔

ذرا غور فرمایئے کہ جب انسان عہدِ طفولیت میں ہوتا ہے تو اس کے ذہن کی دنیا ابھی اتنی محدود ہوتی ہے کہ وہ اپنے والدین ہی کے بارے میں یہ سمجھتا ہے کہ یہی میرے رازق ہیں' یہی میرے محافظ ہیں' یہی میرے دکھ درد محسوس کرنے والے ہیں' مجھے کوئی تکلیف ہو تو اسے یہی رفع کرنے والے ہیں' لہٰذا اس کا غیر شعوری جذبۂ شکر اپنے والدین کی ذات پر مرتکز رہتا ہے' لیکن جیسے جیسے فکر انسانی کا ارتقاء ہوتا ہے اور عقل اپنی ارتقائی منزلیں طے کرتی ہے' انسان کا شعور پروان چڑھتا ہے اور اس کے ذہن میں وسعت پیدا ہوتی ہے تو انسان کو معلوم ہوتا چلا جاتا ہے کہ میں تو بہت سوں کا زیر بار احسان ہوں۔ میرا وطن ہے' میری قوم ہے' میرے اعزّہ و اقرباء ہیں۔ یہ سب کے سب میرے محسن ہیں' میری بھلائی کے لئے سوچتے ہیں۔ میں درجہ بدرجہ ان سب کا زیرِ بارِ احسان ہوں۔ اسی طرح گویا جذبہ شکر پھیل رہا ہے۔ پھر انسان یہاں تک سوچتا ہے کہ یہ زمین جس سے مجھے غذا حاصل ہو رہی ہے' یہ سورج جس سے یہ سارا نظام چل رہا ہے' فصلیں پک رہی ہیں' بارشیں ہو رہی ہیں جن سے مُردہ زمین زندہ ہو جاتی ہے تو میں ان میں سے ہر چیز کا زیر بار احسان ہوں۔ میری جو ضروریات پوری ہو رہی ہیں تو اس پوری کائنات کی ایک ایک شے میری ضروریات زندگی کی بہم رسانی میں لگی ہوئی ہے۔ اس طرح یہ شکر پھیل کر کائنات کی وسعتوں کو اپنے اندر سمولیتا ہے!

اس کے بعد اگر انسان ایک چھلانگ اور لگالے' فکر انسانی اگر ایک قدم اور اٹھالے تو وہ اس نتیجے تک پہنچ سکتا ہے کہ یہ تمام مظاہر فطرت اور ان میں جو تعدّد نظر آ رہا ہے' ان میں جو توافق اور نظم نظر آ رہا ہے' ان سب کا منبع اور سرچشمہ کوئی ایک ذات ہے۔ سورج میں جو تمازت ہے وہ اس کی اپنی نہیں۔ کوئی اور ہے جس نے اس میں یہ حرارت و تمازت رکھی ہے۔ کسی شے میں اگر کوئی وصف ہے تو وہ اس کا ذاتی نہیں' کسی کا عطا کردہ ہے۔ ایک خالق' ایک مدبّر' ایک منعم ہے جس کے انعامات و احسانات کا یہ پورا سلسلہ اس کائنات میں پھیلا ہوا ہے۔ نتیجہ کیا نکلے گا! یہ کہ غور و فکر اور عقل کا یہ ذہنی سفر جب اس حد کو پہنچ جائے

گا تو وہ شکر جو والدین کی ذات سے شروع ہو کر پھیلتا ہوا کائنات کی وسعتوں کو محیط ہو گیا تھا پھر ایک ذات پر مرتکز ہو جائے گا اور وہ سمجھ لے گا کہ شکر کا مستحق حقیقی اللہ ہے۔ یہاں فطرت اور تعقل کے امتزاج سے جو کچھ حاصل ہوا ہے وہ معرفتِ توحیدِ باری تعالیٰ ہے جس کا نتیجہ شکر خداوندی ہے۔ اسی بات کو یوں فرمایا :

﴿وَلَقَدْ اٰتَيْنَا لُقْمٰنَ الْحِكْمَةَ اَنِ اشْكُرْ لِلّٰهِ﴾

"اور بے شک ہم نے لقمان کو دانائی عطا کی اور حکمت سے نوازا کہ شکر کر اللہ کا۔"

معلوم ہوا کہ یہاں کلمہ "اَنْ" حکمت و دانائی کے لازمی و منطقی نتیجے کی جانب رہنمائی کے لئے آیا ہے۔ گویا وہ عقلیت سرے سے حکمت قرار ہی نہیں دی جا سکتی جس سے شکرِ خداوندی کی کیفیت قلب و ذہن میں پیدا نہ ہو۔

مزید برآں اس شکر کے تین درجے ہیں۔ امام راغبؒ نے بہت خوبصورتی سے اس مسئلہ پر بحث کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ شکر کا پہلا درجہ یہ ہے کہ نعمت کا احساس و ادراک ہو۔ ظاہر بات ہے کہ اگر کسی بچے کے ہاتھ پر کوہِ نور ہیرا رکھ دیا جائے تو اسے معلوم ہی نہیں ہو گا کہ اسے کیا چیز دی گئی ہے اور وہ اسے کانچ کا ٹکڑا سمجھے گا۔ لہٰذا جس درجہ کا شکر اس میں پیدا ہونا چاہئے وہ پیدا ہی نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہ اسے شعور ہی نہیں ہے کہ مجھ پر کتنا بڑا احسان کیا گیا ہے! پس پہلا درجہ ہو گا نعمت کا کماحقہٗ ادراک و شعور۔ دوسرا درجہ ہو گا شکر باللسان' یعنی زبان سے بھی منعم و محسن کی حمد و ثناء ہو جسے ہم شکریہ ادا کرنا کہتے ہیں۔ جیسے "Thanks" اور "شُکرًا" کہا جاتا ہے۔ یہ الفاظ متمدن و مہذب معاشرہ میں سب سے زیادہ کہے اور سنے جانے والے الفاظ ہوں گے۔ پھر تیسرا درجہ ہے شکر بالجوارح کا' یعنی اس نعمت کا حق اپنے پورے وجود سے ادا کرو۔ اگر کسی بچے کو اس کے والد نے بہت عمدہ کتاب لا کر دی' بچہ مہذب تھا' اس نے اپنے والد کا شکریہ ادا کر دیا لیکن پھر اس نے اس کتاب کو طاقِ نسیان پر رکھ دیا اور اس سے کوئی استفادہ نہ کیا تو یہ ناشکرا پن ہے' ناقدری ہے۔ لہٰذا نعمت کا حق ادا کرنا بھی شکر کا تقاضا ہے۔

الغرض شکر تقاضائے فطرت ہے' اور عقل سلیم کا مآل یہ ہے کہ اپنے اصل محسن و منعم اور خالق و مالک کو پہچان لے۔ اور ان دونوں کے امتزاج سے اللہ کے شکر و امتنان کے

جذبات کا چشمہ دل کی گہرائیوں سے ابلتا ہے اور اس کی حمد و ثناء کے زمزمے انسان کی زبان پر جاری ہو جاتے ہیں! پھر شکر خداوندی کا تقاضا ہے کہ انسان اللہ کا حق ادا کرے اور اللہ کا سب سے بڑا حق وہ ہے جسے اگلی آیت میں حضرت لقمان کی پہلی نصیحت میں بایں الفاظ بیان کیا گیا:

﴿یٰبُنَیَّ لَا تُشْرِکْ بِاللّٰہِ ؕ اِنَّ الشِّرْکَ لَظُلْمٌ عَظِیْمٌ ۝﴾

"اے میرے پیارے بچے! دیکھنا اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرانا' بلاشبہ شرک بہت بڑا ظلم اور بہت بڑی ناانصافی ہے۔"

انسان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو بے حد و حساب نعمتیں ملی ہیں' اس پر احسانات کی جو بارش ہوئی ہے تو انسان سے اس کی نعمتوں کا جو عظیم ترین حق مطلوب ہے وہ التزامِ توحید اور اجتناب عن الشرک ہے۔ یہ بہت اہم موضوع ہے۔

حکمتِ قرآنی کی اساس دوم

اس رکوع میں حکمت قرآنی کی جو دوسری بات آئی ہے اب اس پر غور کیجئے۔ وہ بات معروف اور منکر یعنی نیکی اور بدی کا تصور ہے۔ قرآن مجید ہمیں بتاتا ہے کہ فطرت انسانی میں نیکی اور بدی کی پہچان اللہ کی جانب سے ودیعت شدہ موجود ہے۔ انسان ان میں طبعاً امتیاز کرتا ہے۔ اس کی ضرورت نہیں ہے کہ انسان کو بتایا جائے کہ سچ بولنا اچھا ہے' جھوٹ بولنا برا ہے۔ انسان کی اپنی فطرت اس بات سے واقف ہے کہ سچائی نیکی ہے اور جھوٹ بدی ہے۔ وعدہ پورا کرنا نیکی ہے' وعدے کی خلاف ورزی کرنا بدی ہے۔ دیانت و صداقت اعلیٰ اقدار ہیں' خیانت و کذب برائیاں ہیں۔ ہمسائے کے ساتھ حسن سلوک خیر ہے' ہمسائے کو پریشان کرنا اور اسے اذیت پہنچانا شر ہے۔ چنانچہ قرآن نے نیکی کے جملہ اعمال و مظاہر کے لئے جو اصطلاح اختیار کی ہے وہ ہے "معروف"۔ معروف کے معنی ہیں "جانی پہچانی چیز"۔ اس کے برعکس بدی کے لئے قرآن کی اصطلاح "منکر" ہے۔ منکر اس چیز کو کہتے ہیں جو پہچان میں نہ آئے' جس سے انسان کی طبیعت کو نفرت اور اباء ہو۔ یہ قرآن حکیم کا اعجاز ہے کہ اس نے ان دو الفاظ کے حوالے سے حکمت کے نہایت اہم مسائل پر

سے پردے ہٹا دیئے ہیں اور ان کو مبرہن کر دیا ہے۔ قرآن بتاتا ہے کہ نہ صرف یہ کہ انسان اپنی فطرت سے جانتا ہے کہ نیکی کیا ہے! بدی کیا ہے! خیر کیا ہے! شر کیا ہے! بلکہ فطرتِ انسانی کا میلان نیکی کی طرف ہے۔ وہ اس کی فطرت کی جانی پہچانی چیز ہے۔ اس کا طبعی رجحان نیکی کی طرف ہے' بدی کی طرف نہیں۔ وہ بدی سے طبعاً نفرت کرتا ہے۔ یہ بالکل علیحدہ بات ہے کہ بالکل غیر معمولی حالات میں یا غلط ماحول سے متاثر ہو کر انسان بدی کا ارتکاب کر بیٹھتا ہے لیکن اس کی فطرت اسے متنبہ کرتی رہتی ہے اور اس کا ضمیر اس کو ٹوکتا رہتا ہے کہ تم غلط راستہ پر جا رہے ہو' اِلّا یہ کہ اس کی فطرت ہی مسخ ہو گئی ہو۔ الغرض یہ ہے حکمتِ قرآنی کی دوسری اہم اساس جس کا تعلق ایمان بالآخرۃ سے ہے۔ یہ بات اس منتخب نصاب میں آئندہ واضح ہو کر سامنے آئے گی کہ اگر نیکی نیکی ہے اور بدی بدی ہے تو نیکی کی جزا ملنی چاہئے' بدی کی سزا۔ گندم از گندم بروید جو ز جو۔ اگر گندم سے گندم اور جو سے جو پیدا ہوتے ہیں تو کیسے ممکن ہے کہ نیکی کی جزا اور بدی کی سزا نہ ملے جو بالعموم اس دنیا میں نہیں ملتی' لہٰذا اس کے لئے کسی دوسرے عالم کی ضرورت ہے۔ یا پھر یہ کہنا پڑے گا کہ نیکی اور بدی برابر ہے' اس میں کوئی فرق و تفاوت نہیں ہے۔ لیکن فطرتِ سلیمہ اور عقل صحیحہ اس کو قبول نہیں کرتی۔ فطرت اور عقل کا فیصلہ یہ ہے کہ نیکی نیکی ہے' بدی بدی ہے اور نیکی کا نتیجہ اچھا اور بدی کا نتیجہ برا نکلنا چاہئے۔ مکافاتِ عمل کی یہی بات حضرت لقمان نے کہی "اے میرے پیارے بچے! نیکی یا بدی خواہ رائی کے دانے کے برابر ہو' پھر خواہ وہ کسی چٹان میں کی گئی ہو یا کہیں فضا کی پہنائیوں میں کی گئی ہو یا کہیں زمین کے پیٹ میں گھس کر کی گئی ہو' اللہ اس کو لے آئے گا" یہ اعمال انسانی ضائع جانے والے نہیں۔ یہ ہیں وہ امور جن کو قرآن حکمت سے موسوم کرتا ہے اور جن تک انسان غور و فکر کے نتیجے میں از خود پہنچ سکتا ہے۔ اگر آپ ان کے لئے لفظ فلسفہ استعمال کرنا چاہیں تو یوں کہا جا سکتا ہے کہ قرآن حکیم کے فلسفہ کی عمارت ان اساسات پر تعمیر ہوتی ہے۔

چند امور کی وضاحت

حکمت قرآنی کی اساسات کے ضمن میں چند امور کی وضاحت ضروری ہے۔

۱۔ انسان پر اللہ تعالیٰ کا شکر تو فرض کے درجے میں ہے۔ جو شخص اللہ کے شکر کی روش اختیار کرے گا' اس کی فطرت میں دوسرے محسنین کے شکر کی عادت اور خو بھی یقیناً پیدا ہوگی۔ چنانچہ نبی اکرم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے : ((مَن لَمْ یَشْکُرِ النَّاسَ لَمْ یَشْکُرِ اللّٰہَ)) یعنی "جو شخص انسانوں کا شکر ادا نہیں کرتا وہ اللہ کا شکر بھی ادا نہیں کرے گا" اس لئے کہ جس کنویں کا پانی خشک ہو چکا ہو اس میں ڈول کوئی بھی ڈالے پانی نہیں نکلے گا۔ جس کی فطرت کے سوتے خشک ہو چکے ہوں اس میں سے شکر کا جذبہ نہ انسانوں کے لئے برآمد ہوگا نہ اللہ کے لئے۔

۲۔ اگر انسان کی فطرت میں شکر کا مادہ ہے اور احسان مندی کا جذبہ ہے تو اس کی اپنی شخصیت کا ارتقاء صحیح رخ پر ہوگا۔ معاذ اللہ' اللہ کو شکر کی احتیاج نہیں ہے۔ کوئی اس کی حمد و ثناء کرے نہ کرے وہ تو اپنی ذات میں غنی ہے' حمید ہے' از خود محمود ہے' ستودہ صفات ہے۔ اس کو شکر کی حاجت نہیں ہے۔ شکر کی ضرورت خود انسان کو ہے۔ یہ جذبہ اس کے اندر اگر موجود ہے تو اس کی شخصیت کا صحیح سمت میں ارتقاء ہوگا اور اس کی خودی اور سیرت کی تعمیر صحیح اساسات پر ہوگی۔

۳۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے ضمن میں انسان کو اپنی ذات اور اپنے نفس کو مقدم رکھنا ضروری ہے۔ ایسا نہ ہو کہ ہم دوسروں کو تو نیکی کی نصیحت و تلقین کریں اور خود اس پر عامل نہ ہوں۔ برائی پر ہم دوسروں کی نکیر کریں' ان پر تنقید کریں اور اپنی برائیوں پر نہ نظر ڈالیں نہ ان کو دور کرنے کی فکر کریں۔ سورۃ البقرہ میں بنی اسرائیل کے جرائم کی جو فہرست بیان ہوئی ہے اس میں ایک جرم یہ بھی فرمایا گیا :

﴿اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ﴾ (البقرۃ : ۴۴)

"کیا تم لوگوں کو نیکی اور بھلائی کا حکم دیتے ہو (اور انہیں اس کی تلقین و نصیحت کرتے ہو) اور اپنے آپ کو بھول جاتے ہو!"

تو انسان میں یہ دونوں وصف بیک وقت مطلوب ہیں۔ وہ اپنی اصلاح کے لئے بھی کوشاں رہے اور دوسروں کو بھی اس کی تلقین کرتا رہے۔ یہ دونوں چیزیں ایک دوسرے کے لئے مدد و معاون ہوں گی۔

۴ ۔ ایک بات یہ بھی سمجھ لیجئے کہ عربی زبان میں "امر" جہاں حکم کے معنی میں آتا ہے وہاں تلقین' نصیحت اور مشورے کے لئے بھی آتا ہے۔ اس کے معانی کلام کے سیاق و سباق کے اعتبار سے متعین ہوتے ہیں۔

۵ ۔ آخری بات یہ کہ احادیثِ نبویہ میں سارا زور نہی عن المنکر پر ملتا ہے۔ اس کی حکمت بھی بادنیٰ تامل سمجھ میں آتی ہے' جس معاشرے میں برائیوں کو گوارا کیا جائے' ان سے صرفِ نظر اور اعراض کیا جائے' ان کو روکنے اور مٹانے سے غفلت اختیار کی جائے تو معاشرے میں نیکیوں کے فروغ اور نشوونما کے لئے ماحول قطعی ناسازگار ہو جائے گا۔ اس کی مثال یہ ہے کہ کسی پھل پھول والے پودے کے ساتھ جو جھاڑ جھنکار اگ آتا ہے اگر باغبان اس کی صفائی نہ کرے تو زمین اور فضاء سے ملنے والی غذائیں اس پودے کے بجائے یہ جھاڑ جھنکار ہڑپ کر جائیں گے اور پودے کو پنپنے اور نشوونما کے لئے غذا میسر ہی نہیں ہو سکے گی۔

۶ ۔ معاشرے سے برائیوں کو دور کرنے کے حدیث میں تین درجے بیان ہوئے ہیں۔ مسلم شریف کی حدیث ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ تم میں سے جو کوئی بھی کسی برائی کو دیکھے تو پہلا درجہ عزیمت کا ہے کہ طاقت سے برائی کو روک دے۔ اگر اس کی استطاعت نہ ہو تو زبان سے تلقین کی جائے' نصیحت کی جائے کہ کیا کر رہے ہو' باز آجاؤ۔ ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ حالات اتنے بگڑ جائیں کہ زبانوں پر تالے ڈال دیئے جائیں' زبان بندی ہو جائے' تو دل میں یہ احساس ضرور رہے' صدمہ ضرور رہے کہ یہ کیا ہو رہا ہے! ایک شدید کرب کا احساس باقی رہے۔ یہ آخری درجہ ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا : "یہ ایمان کا کمزور ترین درجہ ہے"۔ اگر برائیوں پر دل کی کڑھن بھی موجود نہ رہے تو معلوم ہوا کہ ایمان کی رمق بھی اندر باقی نہیں رہی ہے۔ یہ وہ درجہ ہے جس کے بارے میں علامہ اقبال نے کہا کہ ۔

وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا!
کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

حقیقت و اقسامِ شرک

سورۂ لقمان کے دوسرے رکوع میں حکمتِ قرآنی کی جو اساسات بیان ہوئی ہیں اور جس مقام عزیمت کی طرف رہنمائی فرمائی گئی ہے اس کے حوالے سے اختصار و اجمال کے ساتھ رکوع کا لبِّ لباب اور اس کا اصل حاصل بیان ہو گیا' فللّٰہ الحمد۔ اب اس رکوع کی آیت نمبر ۲ پر مزید غور کرنا مقصود ہے' کیونکہ اس میں اجتناب عن الشرک کی تاکید کے ضمن میں التزامِ توحیدِ باری تعالیٰ کا انتہائی تاکیدی حکم وارد ہوا ہے' اور ہر شخص جانتا ہے کہ ہمارے دین کی اصل جڑ بنیاد توحید ہی ہے۔ چنانچہ حضرت لقمان کی نصائح کے ضمن میں پہلی نصیحت بایں الفاظ بیان فرمائی گئی :

﴿یٰبُنَیَّ لَا تُشْرِکْ بِاللّٰہِ ؕ اِنَّ الشِّرْکَ لَظُلْمٌ عَظِیْمٌ ۝﴾

(آیت ۱۳)

"اے میرے پیارے بچے! اللہ کے ساتھ شرک مت کر' یقیناً شرک بہت بڑا ظلم ہے۔"

اس سلسلے میں پہلی اور اہم ترین بات تو یہ جان لینی چاہئے کہ از روئے قرآن مجید ہمارے دین میں شرک سب سے بڑا گناہ اور ناقابل معافی جرم ہے۔ سورۃ النساء میں دو مرتبہ اس بات کو وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ چنانچہ آیت نمبر ۴۸ کے الفاظ ہیں :

﴿اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَکَ بِہٖ وَیَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِکَ لِمَنْ یَّشَآءُ ؕ وَمَنْ یُّشْرِکْ بِاللّٰہِ فَقَدِ افْتَرٰٓی اِثْمًا عَظِیْمًا ۝﴾

"اللہ تعالیٰ اس کو تو ہرگز معاف نہیں فرمائے گا کہ اس کے ساتھ شرک کیا جائے۔ البتہ اس سے کمتر خطائیں اور تقصیریں جس کے لئے چاہے گا بخش دے گا۔ اور جس نے اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرایا' اس نے تو بہت ہی بڑا جھوٹ گھڑا (اور بہت بڑے گناہ کا ارتکاب کیا)"۔

اسی سورہ کی آیت نمبر ۱۱۶ میں یہ مضمون دوبارہ اس شان کے ساتھ وارد ہوا کہ آیت کا پہلا حصہ بعینہٖ وہی ہے جو آیت نمبر ۴۸ کا ہے' دوسرے حصے میں معمولی تغیر ہے' چنانچہ یہاں فرمایا :

﴿وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا بَعِيْدًا ۝﴾

"اور جس نے بھی اللہ کے ساتھ شرک کیا وہ بلاشبہ گمراہی اور ضلالت میں بہت دور نکل گیا۔"

گویا یہاں یہ بات مزید واضح ہو گئی کہ شرک میں ملوث ہونے والا انسان گمراہی میں اتنی دور نکل جاتا ہے کہ اس کے بعد اس کے لئے معافی اور بخشش کا کوئی امکان باقی نہیں رہتا۔

قرآن حکیم کے مطالعہ سے دوسری اہم بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ یہ گناہ اور یہ جرم بہت ہمہ گیر ہے اور اتنا عام ہے کہ اللہ کو ماننے والوں کی اکثریت بھی شعوری یا غیر شعوری طور پر اس میں ملوث ہو جاتی ہے۔ سورۂ یوسف میں ارشاد ہوتا ہے :

﴿وَمَا يُؤْمِنُ اَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ اِلَّا وَهُمْ مُّشْرِكُوْنَ ۝﴾

(آیت ۱۰۶)

"اور نہیں ایمان لاتے ان میں سے اکثر لوگ اللہ پر مگر ساتھ ہی (کسی نہ کسی نوعیت کا) شرک بھی کرتے ہیں۔"

یعنی اکثر لوگ اللہ کو مانتے ہیں' اس پر ایمان لاتے ہیں' لیکن توحیدِ خالص کے ساتھ اللہ کو ماننا' اس پر ایمان رکھنا کسی کسی ہی کو نصیب ہوتا ہے۔ علامہ اقبال نے شرک کی اسی ہمہ گیری کی طرف بایں الفاظ اشارہ کیا ہے۔

براہیمی نظر پیدا مگر مشکل سے ہوتی ہے!
ہوس چھپ چھپ کے سینوں میں بنا لیتی ہے تصویریں

تیسری اہم ترین بات یہ کہ شرک کی بہت سی اقسام ہیں اور یہ مرض بہت متنوع صورتوں میں ظہور کرتا ہے' بلکہ یہ بات بھی جان لینی ضروری ہے کہ ہر دور کا ایک خاص شرک ہوتا ہے۔ اگر کوئی انسان اپنے دور کے شرک کو نہ پہچان پائے تو ہو سکتا ہے کہ وہ سابقہ ادوار کے تمام شرکوں سے تو بچا ہوا ہو اور اپنے خیال میں وہ بہت بڑا موحد بنا پھرتا ہو لیکن وہ اپنے دور کے شرک کو نہ پہچان پایا ہو اور لاعلمی میں وہ اس میں ملوث ہو گیا ہو۔

میرے نزدیک اس دور کا جو شرک سب سے عام اور سب سے زیادہ پھیلا ہوا ہے وہ مادہ پرستی کا شرک ہے۔ ہمارے ہاں مادے اور اس کی تاثیرات پر پورا یقین و اعتماد کیا جاتا ہے

لیکن ذات باری تعالیٰ پر اتنا بھی توکل' یقین اور اعتماد نہیں ہے جو ایمان حقیقی کے لئے لازمی ولابدی ہے۔ اقبال نے اسے اس شعر میں بڑی خوبصورتی سے کہا ہے کہ۔

بتوں سے تجھ کو امیدیں خدا سے نومیدی
مجھے بتا تو سہی اور کافری کیا ہے؟

ایمان اصل میں نام ہے اللہ پر توکّل' اعتماد اور بھروسے کا' اور اس کی نفی کفر اور شرک ہے۔ لہٰذا شرک کے بارے میں بہت حساس ہونے کی ضرورت ہے۔ فارسی زبان کا ایک شعر ہے۔

بہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش
من اندازِ قدت را می شناسم

یعنی "تم چاہے کسی رنگ کا لباس پہن لو' کوئی بھیس بدل لو' میں تمہیں تمہارے قد سے پہچان لوں گا"۔ شرک کے معاملے میں بھی بالکل یہی کیفیت درکار ہے کہ یہ بیماری جس صورت میں بھی کسی دور میں اور کسی معاشرے میں ظہور کر رہی ہو' نگاہ اتنی دور رس ہو کہ انسان پہچان لے کہ اس دور میں شیطان نے شرک کو اس صورت میں جلوہ گر کیا ہے' تب ہی اس بات کا امکان ہے کہ انسان شرک سے اپنے آپ کو بچا سکے۔

چوتھی اہم بات جو درحقیقت ان تینوں باتوں کا منطقی نتیجہ ہے یہ ہے کہ شرک سے کلیۃً بچنا آسان کام نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذکر قرآن مجید میں جب آتا ہے تو اکثر مقامات پر جہاں آکر بات ختم ہوتی ہے وہاں یہ الفاظ آتے ہیں کہ "مَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ" یعنی "ابراہیم مشرکوں میں سے نہ تھے"۔ حضرت ابراہیمؑ کی عظمتِ جلیلہ کو ذہن میں رکھئے۔ آں جنابؑ ہمارے رسول اللہ ﷺ کے جدامجد ہیں' ابوالانبیاء ہیں' امام الناس ہیں' اور خلیل اللہ ہیں۔ ہم درود میں بھی ان کی مثال پیش کرتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ یہ آخری سند ہے جو اللہ کی طرف سے کسی بندے کو عطا ہو جائے۔ یہ سب سے بڑا اور قیمتی سرٹیفکیٹ اور Testimonial ہے جو اللہ کی طرف سے کسی کو دیا جائے کہ "میرا یہ بندہ شرک کے ہر شائبہ سے پاک ہے"۔

اب ہمیں یہ سمجھنا ہو گا کہ شرک اصل میں کہتے کسے ہیں! شرک یعنی اشراک باللہ

(اللہ کے ساتھ کسی کو شریک کر دینا) کی اصل حقیقت کیا ہے جس کو اس آیہ مبارکہ میں ظلم عظیم قرار دیا گیا ہے۔ عربی زبان میں ظلم کی تعریف ہے "کسی چیز کو اس کے اصل اور حقیقی مقام سے ہٹا کر کسی اور جگہ رکھ دینا"۔ یہ فعل ظلم کہلاتا ہے۔ ہر چیز کو اس کے اصل و حقیقی مقام پر رکھئے' یہ عدل ہے' یہ انصاف ہے۔ اب غور فرمائیے تو یہ حقیقت سامنے آئے گی کہ شرک میں دو چیزیں لامحالہ ہوں گی۔ یا اللہ کو اس کے مقامِ رفیع سے گرا کر مخلوقات کی صف میں لا کھڑا کیا جائے گا اور کوئی صفت جو صرف مخلوقات کے لئے ہو گی اس سے اللہ کو متصف کر دیا جائے گا۔ یا مخلوقات میں سے کسی کو اٹھا کر اللہ کے برابر لا بٹھایا جائے گا اور جو صفات صرف باری تعالیٰ کے لئے مختص ہیں ان سے کسی مخلوق کو متصف تسلیم کیا جائے گا۔ یہ دونوں صورتیں یکساں "ظلم" ہیں۔ یہ دونوں افعال "وَضْعُ الشیءِ فی غیر مَحلِّہٖ" کے ذیل میں آئیں گے۔ اللہ کو اس کی منفرد شان رفیع اور مقام جلیل سے گرانا بہت بڑا ظلم ہے اور مخلوق میں سے کسی کو اس کے اصل و حقیقی مقام سے اٹھا کر اللہ کا ہمسر' ہم پلہ' ند' ضد' کفو اور مدمقابل بنا دینا' یہ بھی بہت بڑا ظلم اور بہت بڑی ناانصافی ہے۔

شرک فی الذات

اب اختصار کے ساتھ شرک کی چند اقسام کو سمجھئے۔ اگرچہ اس کی تقسیمیں مختلف اعتبارات سے ہو سکتی ہیں لیکن جس پہلو سے میں تقسیم آپ کے سامنے رکھوں گا مجھے توقع ہے کہ شاید آپ اسے بہت جامع اور نہایت قابل فہم پائیں گے۔ شرک کی تین موٹی موٹی قسمیں ہیں۔ پہلی "شرک فی الذات" اللہ کی ذات میں کسی کو شریک بنا دینا۔ یہ بدترین اور عریاں ترین شرک ہے۔ دوسری "شرک فی الصفات" یہ معاملہ کسی علمی مغالطے کے باعث بھی ہو سکتا ہے۔ تیسری "شرک فی الحقوق" ہے' یعنی اللہ کے حقوق میں کسی کو اس کا ساجھی بنا دینا۔ لہٰذا شرک کی یہ تین بڑی بڑی قسمیں پیش نظر رکھئے' پھر ان کو علیحدہ علیحدہ سمجھئے۔

شرک فی الذات یعنی ذات باری تعالیٰ میں کسی کو شریک کر دینا' اس کی دو قسمیں ہیں۔ ان میں جو سب سے زیادہ مکروہ اور سب سے زیادہ گھناؤنی قسم ہے' عجیب ستم ظریفی

ہے کہ یہ ان قوموں میں پیدا ہوئی جو اپنے آپ کو نبیوں اور رسولوں کی طرف منسوب کرتی ہیں۔ یہودیوں نے حضرت عزیرؑ کو اللہ کا بیٹا قرار دیا۔ مشرکین عرب حضرت ابراہیمؑ کے نام لیوا تھے' انہوں نے فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں قرار دے دیا۔ عیسائیوں نے یہ ظلم ڈھایا کہ اللہ کے رسول حضرت عیسیٰؑ کو اللہ کا بیٹا ہی نہیں صلبی بیٹا قرار دے دیا۔ اس شرک پر اللہ کا غضب بہت بھڑکتا ہے۔ سورۂ مریم کی آیات نمبر ۸۸ تا ۹۲ میں اس کا اظہار اس انداز سے فرمایا گیا ہے :

﴿وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا ○ لَقَدْ جِئْتُمْ شَيْئًا إِدًّا ○ تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ وَتَنْشَقُّ الْأَرْضُ وَتَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا ○ أَنْ دَعَوْا لِلرَّحْمٰنِ وَلَدًا ○ وَمَا يَنْبَغِي لِلرَّحْمٰنِ أَنْ يَتَّخِذَ وَلَدًا ○﴾

"انہوں نے کہا کہ رحمٰن نے کسی کو اپنا بیٹا بنالیا ہے۔ لوگو! تم بہت گستاخی کی بات کر رہے ہو۔ (یہ گستاخی اللہ کی جناب میں اتنی شدید ہے کہ) آسمان پھٹ پڑنے کو ہے' زمین شق ہونے کو ہے اور قریب ہے کہ پہاڑ ایک دھماکے کے ساتھ زمین بوس ہو جائیں' (اس گستاخی پر) کہ لوگوں نے رحمٰن کے لئے بیٹا تراش لیا۔ حالانکہ یہ بات رحمٰن کے شایانِ شان ہی نہیں ہے کہ وہ کسی کو اپنا بیٹا بنائے۔"

اس شرک فی الذات کی دوسری صورت پیدا ہوئی فلسفیانہ مذاہب میں۔ ان میں حلول اور تجسم کے عقیدے پیدا ہوئے جس کا مطلب ہے کہ اس پوری کائنات میں اللہ حلول کر گیا ہے۔ گویا اللہ ہی نے اس کائنات کی صورت اختیار کر لی ہے اور ہر شے اب اللہ کی ذات کا عین بن گئی ہے۔ یہ بھی اپنی نوع کا بدترین شرک ہے۔ پھر ایک اور عقیدہ اوتار کا پیدا ہوا۔ یعنی خدا کسی انسانی شکل و صورت میں ظاہر ہو جاتا ہے یا کسی انسان میں حلول کر جاتا ہے۔ اوتار کا عقیدہ بھی بدترین شرک فی الذات ہے۔

شرک فی الصفات

آگے چلئے ---- شرک فی الصفات کا معاملہ جیسا کہ میں نے عرض کیا تھا کچھ علمی نوعیت کا ہے' اس لئے کہ ہماری زبان میں الفاظ مشترک ہیں۔ جو الفاظ ہم اللہ کے لئے بطور صفت

بولتے ہیں وہی مخلوقات کے لئے بھی بولتے ہیں۔ مثلاً اللہ بھی موجود ہے' ہم بھی موجود ہیں۔ اللہ بھی زندہ ہے' ہم بھی زندہ ہیں۔ اللہ بھی سنتا ہے' ہم بھی سنتے ہیں۔ اللہ بھی دیکھتا ہے' ہم بھی دیکھتے ہیں۔ اب اس لفظی اشتراک سے مغالطہ ہو سکتا ہے۔ لیکن ان صفات کا اطلاق جب اللہ پر ہوتا ہے تو مفہوم کچھ اور ہوتا ہے اور یہی صفات جب مخلوقات کے لئے استعمال ہوں گی تو ان کا مفہوم کچھ اور ہو گا۔ اس ضمن میں تین چیزیں پیش نظر رکھنی ضروری ہیں تاکہ اس معاملے میں مغالطے سے نجات حاصل ہو۔ ایک یہ کہ اللہ کا وجود بھی ذاتی ہے اور صفات بھی ذاتی ہیں' جبکہ ماسوی اللہ کا وجود بھی عطائی ہے اور صفات بھی عطائی ہیں۔ اس لئے کہ مخلوقات کو اللہ ہی نے وجود بخشا ہے اور صفات بھی عطا کی ہیں۔ دوسرے یہ کہ اللہ کا وجود بھی لامحدود ہے اور صفات بھی لامحدود ہیں جبکہ ماسوی اللہ کا وجود بھی محدود ہے اور صفات بھی محدود ہیں۔ تیسرے یہ کہ اللہ کی ہستی بھی قدیم ہے حادث نہیں' ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گی۔ اسی طرح اس کی صفات بھی قدیم ہیں۔ اس کے برعکس معاملہ مخلوقات کا ہے' وہ خود بھی حادث ہیں اور ان کی صفات بھی حادث ہیں۔ ان تینوں چیزوں کا فرق اگر سامنے رکھا جائے تو پھر اس میں مغالطہ نہیں ہو گا' لیکن اگر اس میں ذرا سی بھی بے احتیاطی ہو جائے تو شرک کی صورت پیدا ہو جائے گی۔

شرک فی العبادۃ اور اس کی شاخیں

اب آیئے شرک کی تیسری قسم کی طرف' یعنی اللہ کے حقوق میں کسی کو ساجھی بنا دینا۔ اگر ہم اللہ کے حقوق شمار کریں تو ہم اس کا احصاء نہ کر سکیں گے۔ لیکن ایک لفظ ایسا ہے کہ "ہاتھی کے پاؤں میں سب کا پاؤں" کے مصداق اس میں سب حقوق آ جاتے ہیں' اور وہ لفظ ہے "عبادت"۔ اللہ کی عبادت میں کسی کو شریک نہ ٹھہرایا جائے۔ لیکن اس لفظ عبادت کی قدرے تشریح ہو گی تو بات سمجھ میں آئے گی۔ اس ضمن میں قارئین کرام سے درخواست ہے کہ پانچ چیزیں گن کر ذہن نشین کر لیں۔ عبادت میں اہم ترین چیز ہے "اطاعت"۔ توحید فی الاطاعت یہ ہے کہ اللہ کی اطاعت تمام اطاعتوں پر غالب آ جائے۔ بقیہ تمام اطاعتیں اللہ کی اطاعت کے تابع ہوں۔ اگر کسی کی اطاعت اللہ کی اطاعت کے

برابر ہو گئی تو یہ شرک فی الاطاعت ہو جائے گا۔ تمام اطاعتیں اللہ کے تابع ہوں تو یہ توحید ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ((لَا طَاعَةَ لِمَخْلُوقٍ فِی مَعْصِیَةِ الْخَالِقِ)) یعنی "کسی مخلوق کی اطاعت نہیں ہوگی اس چیز میں کہ جس میں خالق کی معصیت لازم آ رہی ہو"۔ اللہ کی اطاعت کے تابع والدین کی اطاعت بھی ہے' اساتذہ کی بھی ہے' اولی الامر کی بھی ہے' حکام کی بھی ہے۔ کوئی اطاعت اللہ کی اطاعت سے آزاد نہ ہو۔ اگر آزاد ہوئی تو شرک فی الاطاعت لازم آ جائے گا۔ یہاں یہ نکتہ بھی نوٹ کر لیجئے کہ اللہ کی اطاعت جناب محمدؐ رسول اللہ ﷺ کے واسطے سے ہوگی۔ قرآن مجید بھی ہمیں نبی اکرم ﷺ کے توسط سے ملا ہے۔

دوسری چیز ہے "محبت"۔ تمام محبتیں اللہ کی محبت کے تابع ہو جائیں۔ کوئی محبت اللہ کی محبت کے ہم پلہ نہ ہو۔ ہمارے قلب کے سنگھاسن پر بالاترین محبت اللہ کی براجمان ہو۔ بقیہ تمام محبتیں اللہ کی محبت کے تابع ہو جائیں۔ اگر کسی اور کی محبت برابر اللہ کی محبت کے آ کر بیٹھ گئی تو جان لیجئے کہ یہی شرک ہے۔ یہ دو چیزیں "اطاعت اور محبت" بہت اہم ہیں۔ ان کی تفصیل میں جانے کا موقع نہیں ہے۔ بس یوں سمجھ لیجئے کہ یہ وہ اصول ہیں کہ جن کو انسان خود حالات پر منطبق کر سکتا ہے۔ اصول اگر ہاتھ میں آ جائیں تو ان کا اطلاق کر کے انسان تمام مسائل حل کر لے گا۔ ایک ضروری بات یہاں پھر نوٹ کر لیجئے کہ اطاعت اور محبت دونوں اعتبارات سے اللہ کے ساتھ اللہ کے رسول ﷺ بھی شامل ہیں۔ اللہ کی اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت تمام اطاعتوں پر غالب ہو تو یہ توحید ہے۔ کوئی اور اطاعت ان کے ہم پلہ ہو گئی یا بالاتر ہو گئی اور کوئی محبت ان کے برابر ہو گئی یا بڑھ گئی تو یہ شرک فی الاطاعت اور شرک فی المحبت کی صورت ہوگی۔

تیسری چیز ہے دعا۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ((اَلدُّعَاءُ مُخُّ الْعِبَادَةِ)) "دعا عبادت کا جوہر ہے"۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ ((اَلدُّعَاءُ هُوَ الْعِبَادَةُ)) "دعا ہی اصل عبادت ہے"۔ چنانچہ دعا اللہ کے سوا کسی سے نہیں کی جائے گی۔ قرآن مجید میں فرمایا گیا: ﴿وَلَا تَدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ﴾ (القصص: ۸۸) یعنی "اللہ کے ساتھ کسی معبود کو مت پکارو"۔ پکارو اسی کو' مانگو اسی سے۔ یہ ہے توحید فی الدعاء۔ اور اگر اللہ

سے بھی دعا کر رہے ہو' مانگ رہے ہو اور کسی اور سے بھی تو یہ شرک فی الدعاء ہے۔

چوتھی چیز ہے اخلاص۔ اگر متذکرہ بالا تینوں باتوں میں ریاکاری کا کہیں شائبہ ہو گیا تو یہ بھی شرک ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا : ((مَنْ صَلّٰی یُرَائِی فَقَدْ اَشْرَکَ' وَمَنْ صَامَ یُرَائِی فَقَدْ اَشْرَکَ' وَمَنْ تَصَدَّقَ یُرَائِی فَقَدْ اَشْرَکَ)) "جس نے دکھلاوے کے لئے نماز پڑھی وہ شرک کر چکا' جس نے دکھلاوے کے لئے روزہ رکھا وہ شرک کر چکا' جس نے دکھاوے کے لئے صدقہ و خیرات کیا وہ شرک کر چکا"۔ یہ شرکِ خفی کہلاتا ہے جو نظر نہیں آتا۔ اقبال نے جو کہا ہے کہ ع

ہوس چھپ چھپ کے سینوں میں بنا لیتی ہے تصویریں!

تو اس کا اطلاق اسی نوع کے شرک پر ہوتا ہے۔ حضور ﷺ نے تجزیہ کر کے بتا دیا کہ اگر ایک شخص نماز پڑھنے کھڑا ہوا اور اس نے دیکھا کہ کوئی مجھے دیکھ رہا ہے' اس لئے سجدہ طویل کر دیا تو اس نے شرک خفی کا ارتکاب کیا' چونکہ اس طرح اس کے سجدے کے مسجود دو ہو گئے۔ وہ اللہ کو بھی سجدہ کر رہا ہے اور جسے دکھا رہا ہے گویا اسے بھی سجدہ کر رہا ہے۔ معلوم ہوا کہ ریا و سُمعہ یعنی عبادت دوسروں کو دکھانے یا سنانے کی نیت سے کرنا شرک فی الاخلاص ہے۔

خواہشِ نفس کی بلا قید پیروی بھی شرک ہے۔ قرآن مجید میں دو جگہ یہ مضمون آیا ہے :

﴿اَرَءَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ﴾ (الفرقان : ۴۳)

اور

﴿اَفَرَءَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ﴾ (الجاثیہ : ۲۳)

یعنی "اے نبی! کیا آپ نے اس شخص کے حال پر غور کیا جس نے اپنی خواہش کو اپنا معبود بنا لیا"۔ یہاں لفظ "الٰہ" آیا ہے جو ہمارے کلمۂ توحید کے جزوِ اول کا لفظ ہے۔ معلوم ہوا کہ صرف سامنے رکھی ہوئی مورتیاں ہی نہیں پوجی جاتیں' اندر کی نفسانی خواہشات کو بھی پوجا جاتا ہے۔

باطن کے اصنام میں مال و دولت کی وہ محبت بھی شامل ہے جس کے حصول میں حلال و

حرام کی تمیز ختم ہو جائے۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا : ((هَلَكَ عَبْدُ الدِّينَارِ وَعَبْدُ الدِّرْهَمِ)) "ہلاک ہو جائے یا ہلاک ہو گیا دینار و درہم کا بندہ"۔ آنحضور ﷺ نے لفظ کون سا استعمال فرمایا! عبد' اس لئے کہ جس شخص کے دل میں دولت کی محبت اتنی ہے کہ اسے کوئی غرض نہیں کہ حلال سے آئے یا حرام سے' جائز سے آئے یا ناجائز سے' صحیح راستے سے آئے یا غلط راستے سے، دولت کی اس طمع اور محبت کا مطلب ہے کہ دولت اس کا معبود ہے' چاہے وہ ہندوؤں کی طرح "لکشمی دیوی" کو نہ پوج رہا ہو۔ شریعت کی قیود و حدود اور شرائط سے بے نیاز ہو کر دولت کی چاہت بھی شرک ہے۔

اس ضمن میں پانچویں اور آخری چیز یہ ہے کہ کچھ مراسم عبودیت ایسے ہیں جو صرف اللہ کے لئے خاص ہیں۔ کسی کو بھی سجدہ نہیں ہو گا سوائے اللہ کے۔ اس معاملے میں شیخ احمد سرہندیؒ کا جو مقام تھا اور ان کی جو عزیمت تھی' اسے علامہ اقبال نے خوب تعبیر کیا ہے۔

گردن نہ جھکی جس کی جہانگیر کے آگے
جس کے نفسِ گرم سے ہے گرمیٔ احرار

سجدہ صرف اللہ کے لئے ہے۔ اسی طرح رکوع بھی اللہ کے لئے خاص ہے' اس کے خلاف عمل شرک فی العبادۃ میں شمار ہو گا۔

یہاں موقع کی مناسبت سے شرک کی چند موٹی موٹی اقسام ہی بیان کی جا سکی ہیں' لیکن ان سے اندازہ ہو گیا ہو گا کہ شرک کا مسئلہ کتنا ہمہ گیر ہے۔ ہر مسلمان کو شعوری طور پر شرک سے بچنے کی فکر کرنی چاہئے۔ اس کی تیر بہ ہدف تدبیر یہ ہے کہ اللہ کی ذات پر ہمارا یقین محکم ہو۔ ہمارا جتنا توکل اور اعتماد اللہ کی ذات اور اس کی ربوبیت پر بڑھے گا اتنا ہی ہم ان تمام چیزوں سے بچ سکیں گے۔ جیسے علامہ اقبال نے کہا ہے۔

یہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے!
ہزار سجدوں سے دیتا ہے آدمی کو نجات

اگر ہمیں التزامِ توحید اور اجتنابِ شرک کی سعادت نصیب ہو جائے تو یہ ہماری اخروی کامیابی اور فوز و فلاح کے لئے کفایت کرے گی۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ ○○

منصبِ افتاء اور مُفتی کی ذِمّہ داریاں

تحریر : محمد المکّی ناصری' ترجمہ : پروفیسر نور احمد شاہتاز

منصب افتاء جس قدر پر وقار ہے اتنی ہی یہ ذمہ داری نازک بھی ہے۔ اس منصب کے کچھ اپنے تقاضے ہیں۔ ثقاہت علمی اور عدالت و دیانتداری کے ساتھ ساتھ ایک مفتی کا دور اندیش اور زیرک ہونا بھی انتہائی ضروری ہے۔ پاکستان کے تقریباً تمام شہروں اور دیہاتوں میں نامور مفتیان کرام کی ایک بڑی تعداد بحمد اللہ فریضہ افتاء کی ادائیگی میں مصروف ہے اور عوام پاکستان دینی معاملات میں مفتی کی رائے (فتویٰ) کو ہی حتمی سمجھتے ہیں۔ اصحاب علم و فضل اور نامی گرامی مفتی صاحبان کے علاوہ ایسے افراد کی بھی ہمارے ہاں کمی نہیں جو محض نام و نمود کی غرض سے اپنے نام کے ساتھ مفتی کا سابقہ لاحقہ بڑے طمطراق سے استعمال کرتے ہیں اگرچہ وہ اس علمی و فقہی معیار پر کسی طور پر پورے نہ اترتے ہوں جو مفتی کے لئے درکار ہے۔ چنانچہ گلی محلوں میں اس طرح کے مفتیوں کی کمی نہیں جو محض اپنے قد کاٹھ' ڈیل ڈول' وضع قطع اور جبہ و دستار کے بل بوتے پر مفتی کے درجہ پر فائز ہیں۔ اس طرح کے مفتی حضرات عموماً بڑے سوشل (Social) اور جذبہ افہام و تفہیم (Compromising mind) کے حامل ہوتے ہیں اور علاقہ میں ان کا اثر و رسوخ بھی ان کی انہی خوبیوں کی بناء پر ہوتا ہے۔ دینی مسائل میں ان کے ہاں خاصی لچک پائی جاتی ہے' اور اختلافی مسائل میں ان کی رائے کا ایک اہم اصول "ایک روایت میں یوں بھی آتا ہے" مقرر ہے۔

چونکہ بدقسمتی سے ہمارے ہاں لوگ دیگر شرعی مسائل کی طرح "منصب مفتی" کے لئے بھی بنیادی شرائط اہلیت تک سے واقف و آگاہ نہیں' اس لئے وہ ہر "دعویدار مفتی" اور ہر "امیدوارِ منصب افتاء" کو محض اس کے دعویٰ کی بنیاد پر مفتی تسلیم کرتے ہوئے اس سے شرعی مسائل میں رجوع کرنے لگتے ہیں اور پھر جب اس کی دی ہوئی رائے (فتویٰ) کو مطابق شریعت نہیں پاتے تو وہ دین اور علماء دین کے خلاف یکساں منفی رجحانات کا شکار ہو کر

اصل مفتیوں اور شرع اسلام تک کو نظروں سے گرا دیتے ہیں۔

پاکستان میں کچھ لوگ حادثاتی طور پر بھی مفتی بن گئے ہیں۔ مثلاً کسی دینی ادارے کے سربراہ کا انتقال ہوا جو واقعی مفتی تھے تو اب ان کا انتظامی جانشین بھی منصب افتاء پر براجمان ہو گیا' جبکہ کچھ لوگوں کو وفاقی شرعی عدالت اور اسلامی نظریاتی کونسل کی ممبری کی ہوس نے مفتی بنا دیا۔ وفاقی شرعی عدالت کے قیام کے وقت یہ طے پایا تھا کہ اس میں ایسے اسکالرز کو شامل کیا جائے گا جو کم از کم پندرہ سال سے تدریسی' تحقیقی یا افتاء کی ذمہ داری ادا کر رہے ہوں۔ شروع شروع میں واقعتاً حقیقی علماء و اسکالرز ہی کو اس میں شامل کیا گیا۔ لیکن ضیاء الحق مرحوم کے انتقال کے بعد جیسے ہی "عوامی دور" آیا اسلامی نظریاتی کونسل اور وفاقی شرعی عدالت میں بھی عوامی قسم کے مفتیوں کے تقرر کا سلسلہ شروع ہوا۔ چنانچہ بہت سے عوامی مفتیوں نے شیروانیوں سمیت اسلام آباد یاترا شروع کر دی۔ مذکورہ اداروں میں گنجائش کم تھی' کچھ کی قسمت نے یاوری نہ کی اور پھر اقتدار کے ردوبدل میں بہت سے امیدواروں کی شیروانیاں بغیر حلف لئے پرانی ہو گئیں۔ کئی خود ساختہ مفتی ان اداروں میں جانے سے محروم رہے' تاہم انہیں یہ فائدہ ضرور ہوا کہ اس طرح انہیں اپنے نام کے ساتھ مفتی کا بھاری بھرکم لفظ استعمال کرنے کا بہانہ ہاتھ آ گیا۔ اللہ ان کے حال پر رحم فرمائے۔

ذیل میں منصب افتاء کے لئے درکار اہلیت اور مفتی کا ٹائٹل (لقب) استعمال کرنے کی اجازت سے متعلق فقہاء و آئمہ اسلام کی تصریحات و آراء پر مبنی ایک فکر انگیز تحریر کا ترجمہ پیش کیا جاتا ہے' جو محمد المکی ناصری کی ہے اور "الشریعة والفقه والقانون" نامی رسالہ سے ماخوذ ہے' جو مراکش سے شائع ہوا ہے :

ظہورِ اسلام سے اہل اسلام اپنے مذہب کی تعلیمات نسل در نسل حاصل کرتے رہے ہیں۔ سابقون الاولون نے تعلیم دین براہ راست جناب سرور کائنات خاتم الانبیاء والمرسلین علیہ الصلوۃ والسلام سے حاصل کی اور نبی اکرم ﷺ نے امت کو تعلیم دین اس فریضہ کی ادائیگی کے طور پر فرمائی جس کے لئے آپ مبعوث کئے گئے تھے اور اس حکم کی تعمیل فرمائی جو آپ کو آپ کے رب نے ان الفاظ میں دیا تھا۔

﴿ يَاأَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ ۖ وَإِنْ لَمْ

تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ ﴾ (المائدۃ : ٦٧)

صحابہ رضی اللہ عنہم کے بعد لوگوں نے تعلیم دین ان لوگوں سے پائی جو "ورثہ رسول" اور حاملین دین متین قرار پائے۔ امت کے اس گروہ نے تبلیغ دین کا فریضہ اس حکم ربانی کے پیش نظر دیا : "لَتُبَيِّنُنَّهٗ لِلنَّاسِ وَلَا تَكْتُمُوْنَهٗ" (آل عمران : ۱۸۷) نیز "اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ وَالْهُدٰى مِنْۢ بَعْدِ مَا بَيَّنّٰهُ لِلنَّاسِ فِي الْكِتٰبِ اُولٰٓئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللّٰهُ وَيَلْعَنُهُمُ اللّٰعِنُوْنَ (البقرۃ : ۱۵۹)

چونکہ ان اہل علم کے نزدیک (حسب حکم الٰہی) کتمانِ دین موجبِ لعنت تھا اس لئے انہوں نے تبلیغ دین میں کوئی کسر نہیں رہنے دی۔

قران کریم کا یہ اعجاز ہے کہ اس نے دیگر اوصاف کے علاوہ سابقون الاولون کے ان سوالات کو بھی محفوظ رکھا ہے جو وہ نبی اکرم ﷺ سے تعلیم دین کے سلسلہ میں کیا کرتے تھے۔ ان سوالات کی حفاظت اس لئے بھی ممکن ہوئی کہ یہ نزول وحی کا زمانہ تھا اور احکام شرعیہ کے بارے میں استفسارات یا بیان شدہ احکامات کی تشریح و توضیح کے سلسلہ میں سوالات کے جوابات بذریعہ وحی دیئے جاتے تھے۔ اکثر و بیشتر اس قسم کے استفسارات کے لئے جو صیغہ قرآن نے استعمال کیا ہے وہ "سوال" کا ہے اور بسا اوقات لفظ "استفسار" استعمال ہوا ہے جس کے معنی "طلبِ فتویٰ" ہیں۔ اس قسم کے بعض سوالات سورۂ بقرہ میں ہیں' جن کی تعداد سات ہے {۱} ایک سوال سورۂ مائدہ' ایک سورۂ انفال اور دو سورۃ النساء میں ہیں۔ {۱'۲'۳} مثلاً

وَيَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِيْضِ ' قُلْ هُوَ اَذًى .....الخ

وَيَسْتَفْتُوْنَكَ فِي النِّسَآءِ ' قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيْكُمْ فِيْهِنَّ .....الخ

یہ تو سوالات و استفسارات کی وہ قسم ہے جو اہل ایمان کی طرف سے کئے گئے یا تعلیم و اخذ دین کی خاطر تھے اور جن کے پیچھے مثبت جذبہ (Positive Thinking) کارفرما تھا۔ جبکہ استفسارات کی دوسری قسم وہ ہے جس کا تعلق اعداء اسلام سے ہے' ایسے استفسارات ہمارا موضوع بحث نہیں کیونکہ ان کا مقصد حقائق دین جاننا ہرگز نہ تھا بلکہ غرض دین میں

جدال و فساد اور خواہ مخواہ کی بحث و تکرار پیدا کرنا تھا تا کہ لوگوں بالخصوص نو مسلموں کے ذہن کو پراگندہ اور نبی اکرم ﷺ کو پریشان کیا جا سکے۔ ایسے استفسارات کی مثال "وَيَسْئَلُونَكَ عَنِ الرُّوحِ قُلِ الرُّوحُ مِنْ أَمْرِ رَبِّي" {۵} ہے۔

جہاں قرآن کریم نے دینی نوعیت کے ایسے استفسارات جو صیغہ سوال سے شروع ہوتے ہیں انہیں محفوظ کیا وہیں سنّتِ رسول ﷺ نے ایسے متعدد استفسارات کی حفاظت کا بندوبست کر دیا جن میں صیغہ استفتاء یا افتاء کا استعمال زبان رسالت یا کلام صحابہ و تابعین سے ثابت ہے۔ اس قسم کے استفسارات سے کتب صحاح و سنن و مسانید کا ذخیرہ مملو ہے۔ چنانچہ اسی نہج پر چلتے ہوئے سلف صالحین کی اتباع میں مسلمانوں کے ہاں استفتاء و افتاء کی سنت جاری ہوئی اور اس کے لئے لفظ فتویٰ کا استعمال عام ہوا۔ اب ہر دینی معاملہ و شرعی استفسار استفتاء یا فتویٰ کہلاتا ہے۔

لفظ فتویٰ کا اشتقاق اور فقہاء کے ہاں اس کے اصطلاحی معنی

لغت کی کتابوں کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ لفظ "الفتوی" اشتقاقی لحاظ سے لفظ "الفتاء" سے گہرا تعلق رکھتا ہے اور الفتاء کے معنی نو عمری کے ہوتے ہیں کہا جاتا ہے فتو' یفتو' فتاء' وفتی' یفتی' فتی' فهو فتی السن یعنی نو عمر۔

علامہ ابن منظور افریقی نے لسان العرب میں اور ان کی متابعت میں ابو حیان نے اپنی تفسیر میں اس آیت کریمہ (وَيَسْتَفْتُونَكَ فِي النِّسَاءِ) کے {۶} ضمن میں لکھا ہے "الفتیاء) تبیین' لمشکل من الاحکام "یعنی "فتیا" کے معنی احکام میں مشکل امور کی وضاحت کے ہیں' اور اس کی اصل "الفتی" ہے جس کے معنی ایسا نوجوان جو پروان چڑھ رہا ہو اور توانا ہو' گویا مفتی وہ ہے جو ایسے امور کی وضاحت کر کے انہیں جاندار بنا دے جن کا سمجھنا ویسے دشوار ہو۔

امام رازی نے "أَفْتُونِي فِي أَمْرِي" کے معنی میں لکھا ہے "ای افتونی' اجیبونی فی الامر الفتی "یعنی اس مشکل امر میں مجھے مشورہ دو' جواب دو۔ اور

فتویٰ کے معنی کسی مسئلہ میں نیا جواب ہیں۔ گویا یہ لفظ "حدیث السن" یا نو عمری کے لئے استعمال ہونے والے صیغہ "فتی" سے استعارۃً لیا گیا ہے {۷}۔ شافعیہ کا کہنا ہے کہ فتویٰ کے معنی کسی نئے پیش آمدہ مسئلہ کا نیا جواب ہیں اور یہ ظاہر ہے کہ پیش آمدہ مسئلہ یا تو فی نفسہ بالکل نیا ہو گا یا پھر اس سے ملتے جلتے مخصوص مسائل کے اعتبار سے وہ نیا ہو گا {۸}۔

اصطلاح فقہاء میں فتویٰ کے معنی کسی شرعی مسئلہ میں مستفتی کو اس پر عمل کا پابند کئے بغیر حکم شرعی کو بیان کر دینا ہے اور استفتاء کا جواب مفتی کی جانب سے زبانی ہو گا' الا یہ کہ سائل تحریری سوال کرے اور اس کا تحریری جواب چاہے۔

چونکہ دین امور میں فتویٰ دینے کی ذمہ داری انتہائی اہم ہے اور مسلمانوں کی زندگی پر فتویٰ کے مثبت یا منفی اثرات بھی یقینی ہیں' اس لئے مختلف مذاہب فقہ کے علماء نے فتویٰ نویسی یا "افتاء" کو خصوصی اہمیت دی ہے اور اس کے لئے باقاعدہ قواعد و ضوابط مقرر کئے ہیں جن کا لحاظ رکھنا اور ان سے غفلت نہ برتنا مفتی کے لئے انتہائی ضروری ہے تا کہ اس شعبہ کو بازیچہ اطفال نہ بنا لیا جائے۔ ایسے لوگ جو اس منصب کے اہل نہ ہوں انہیں اس منصب کے وقار کی پامالی کا باعث نہ بننا چاہئے اور اہل ہوا و ہوس کو اسے اپنی خواہشات کا تختہ مشق نہ بنانا چاہئے تا کہ "افتاء" مذاق بن کر نہ رہ جائے۔

اس کا صحیح علاج ابو القاسم الصیمری محمد بن اسحاق (۲۷۵ھ) نے' ابو بکر خطیب بغدادی نے' ابو عمرو عثمان بن اصلاح نے' امام نووی نے' شہاب الدین احمد بن ادریس القرافی نے' شمس الدین الذہبی نے' ابن قیم جوزیہ نے اور برہان الدین ابن فرحون نے تجویز کیا ہے۔ اسی طرح گیارہویں صدی ہجری کے بعض مشائخ جیسے ابراہیم اللقانی' منصور بن یونس البہوتی اور تیرھویں صدی کے بعض علماء جیسے محمد بن علی السنوی نے اس کا حل تجویز کیا ہے۔ اسی طرح مختصر خلیل کے بعض شارحین جیسے الحطاب اور تحفہ ابن عاصم کے بعض شارحین جیسے التسولی وغیرہ نے بھی اس موضوع پر لکھا ہے۔ یہ تمام مشائخ اس بات پر متفق ہیں کہ فتویٰ کے غلط استعمال و اصدار کے نتائج بہر حال خطرناک ہو سکتے ہیں۔ لہٰذا اس منصب پر ایسے ہی شخص کو فائز ہونا چاہئے جس کی علمی ثقاہت' فکری نزاہت نیز دین سے پختہ تعلق مسلم ہو۔

کارِ افتاء کی ذمہ داری کس پر ڈالی جائے؟

امام مالک کہتے ہیں کسی عالم کو اس وقت تک فتویٰ دینے کا اختیار نہیں جب تک لوگ (اہل علم) اسے اس لائق قرار نہ دیں۔ یعنی اس کی اہلیت پر علماء صاد کریں اور وہ خود بھی اپنے آپ کو اس قابل سمجھتا ہو {۹} امام دار الہجرۃ امام مالک خود اپنے بارے میں کہتے ہیں کہ میں نے اس وقت تک فتویٰ دینا شروع نہیں کیا جب تک کہ ستر (۷۰) جید علماء نے اس بات کی توثیق نہیں کی کہ میں اس کی صلاحیت رکھتا ہوں۔ {۱۰}

المازری کہتے ہیں : "قاضی کو یہ حق نہیں کہ وہ کسی کو مفتی مقرر کرے بلکہ فقہاء ہی کسی کو یہ منصب سونپ سکتے ہیں"۔ {۱۱}

خطیب بغدادی کہتے ہیں "امام (حاکم) کو چاہئے کہ وہ مفتیوں کے ذاتی کردار اور علمی حیثیت کی چھان بین کرے' پھر جسے اس قابل پائے اس کا تقرر کرے اور جس میں یہ صلاحیت نہ پائے اسے معزول کر دے بلکہ اس کو ڈرا بھی دے کہ بلا اہلیت وہ اس منصب تک دوبارہ پہنچا تو اسے سزا دی جائے گی۔ رہا مسئلہ یہ کہ امام (حاکم) کس طرح صحیح مفتی کا انتخاب کرے تو اس کے بارے میں وہ کہتے ہیں کہ وہ ہم عصر علماء سے دریافت کرے اور ان میں سے ثقہ علماء کی رائے کو اختیار کرے"۔ {۱۲}

ابو الفرج ابن جوزی کہتے ہیں کہ ایسے لوگ جو فتویٰ دینے کے اہل نہ ہوں مگر مفتی بن بیٹھیں ان کے ساتھ وہی کرنا چاہئے جو بنو امیہ نے کیا کیونکہ یہ ایسے لوگ ہیں جنہیں خود تو راستہ معلوم نہیں مگر سواروں کو راستہ و منزل بتاتے ہیں یا ان کی مثال ان لوگوں کی سے ہے جنہیں طب کی ابجد تک معلوم نہیں مگر معالج بنے بیٹھے ہیں۔ بلکہ خود ساختہ مفتی تو ان تمام قسم کے لوگوں سے بدتر ہے اور جب ایک ایسے شخص کو علاج کرنے کی حکومت اجازت نہیں دیتی جو ماہر طبیب نہ ہو بلکہ صرف عطائی ہو تو پھر کسی ایسے شخص کو "افتاء" کی اجازت دینا جو کتاب و سنت کا عالم اور فقیہ نہ ہو' سراسر ظلم و زیادتی ہے۔

اس موقف کی تائید اس حدیث رسول (ﷺ) سے بھی ہوتی ہے جس کے راوی حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص ہیں کہ : اللہ تعالیٰ علم کو یوں نہیں اٹھائے گا کہ علم ہی

اچک لیا جائے بلکہ علم اس طرح اٹھایا جائے گا کہ کوئی عالم نہ رہے گا اور لوگ جاہلوں کو اپنا سردار بنانے لگیں گے جو بغیر علم کے لوگوں کے استفسارات کا جواب اور استفسارات پر فتویٰ جاری کرنے لگیں گے' چنانچہ یہ جو خود گمراہ ہیں اوروں کو بھی گمراہ کریں گے۔"

حافظ ابن حجر نے اس حدیث سے استدلال کرتے ہوئے کہا کہ افتاء میں حقیقتاً سرداری ہے اور اس حدیث سے انہوں نے جاہل مفتیوں کی مذمت پر استدلال کیا ہے۔ بعض مشائخ کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ جاہل قسم کے مفتیوں پر سخت برہم ہوتے' یہاں تک کہ کسی نے ابن قیم سے ازراہ تمسخر کہہ دیا کہ آپ مفتیوں کے محتسب ہیں؟ اس پر انہوں نے کہا: کیوں نہیں؟ اگر روٹی پکانے والوں اور باورچیوں پر محتسب مقرر ہو سکتا ہے تو مفتیوں پر محتسب کیوں نہیں ہو سکتا؟ {۱۳}

تحفہ ابن عاصم کے شارح شیخ التسولی کے زمانہ (۱۲۴۳ھ) میں "المغرب" میں احتیاطی تدابیر کے طور پر امام (حاکم) کو مفتیوں کی نگرانی و سرزنش کی ذمہ داری بھی سونپی گئی تھی۔ نظام قضاء پر جاہل مفتیوں کے فتاویٰ کے منفی اثرات کے پیش نظر افتاء عام پر پابندی لگا دی گئی تھی۔ التسولی نے اس پابندی پر تنقید کی اور کہا کہ افتاء قضاء کی طرح فرض کفایہ ہے۔ {۱۴}

(جاری ہے)

حواشی

{۱} سورۃ البقرہ' آیات ۱۸۹۔۲۱۵۔۲۱۷۔۲۱۹۔۲۲۰۔۲۲۲
{۲} سورۃ المائدہ' آیت نمبر ۴
{۳} سورۃ الانفال' آیت نمبر ۱
{۴} سورۃ النساء' آیت نمبر ۱۲۷۔۱۷۶
{۵} ابن العربی' احکام القرآن جلد ۱' ص ۵۰۳
{۶} ابو حیان' تفسیر ابی حیان جلد ۳' ص ۳۵۹
{۷} فخر الدین رازی' تفسیر کبیر' جلد ۶' ص ۴۰۸
{۸} ابراہیم اللقانی' اصول الفتویٰ' ص ۴۳' ۴۴ (غیر مطبوعہ)
{۹} القرافی' الفروق' جلد ۲' ص ۱۱۰
{۱۰} النووی' المجموع جلد' ص ۴۱
{۱۱} التسولی' جلد ۱' ص ۴۵
{۱۲} ادب الفقیہ والمتفقہ' ج ۲' ص ۱۵۲
{۱۳} ابن قیم' اعلام الموقعین' ج ۴' ص ۱۸۹
{۱۴} التسولی علی التحفہ' ج ۱' ص ۴۵

قیمتوں میں اضافہ'
اشاریہ بندی (INDEXATION) اور ربا
ایک نوٹ

محمد اکرم خان☆

حکمت قرآن کے سابقہ شماروں میں جناب مولانا محمد طاسین صاحب اور حافظ عاطف وحید صاحب کی فکر انگیز بحث' قیمتوں میں اضافہ سے اشاریہ بندی اور ربا کے مسئلہ پر چل رہی ہے۔ آہستہ آہستہ بحث میں باریک نکتے پیدا ہونے سے ڈر ہے کہ کہیں اصل مسئلہ ہی نظروں سے اوجھل نہ ہو جائے۔ لہٰذا اس نوٹ کا مقصد از سر نو نفس مسئلہ کی تنقیح اور اس کے حل طلب پہلوؤں کی طرف اشارہ کرنا ہے۔

قیمتوں میں اضافہ کا مسلسل رجحان دوسری جنگ عظیم کے بعد ہوا۔ اس سے پہلے قیمتوں میں اضافہ بہت معمولی اور برسوں میں ہوا کرتا تھا۔ تاہم یہ بھی حقیقت ہے کہ قیمتوں میں اضافہ اور کمی دونوں ہی ہوتے رہتے تھے۔ لیکن دوسری جنگ عظیم کے بعد دنیا بھر میں یہ اضافہ ایک تسلسل سے ہونے لگا جس کی وجہ سے بہت سے مسائل پیدا ہوئے' جن میں سے ایک مسئلہ وہ ہے جو اس وقت زیر بحث ہے۔

مسئلہ کا خلاصہ یہ ہے کہ قیمتوں میں مسلسل اضافہ ہونے کی وجہ سے زر کی قوت خرید میں کمی ہو جاتی ہے' جس کے نتیجے میں وہ ادائیگیاں جن میں مہلت یا وقت درکار ہوتا ہے ان میں دائن کو فائدہ رہتا ہے اور مدیون کو نقصان۔ قرض حسن کی شکل میں ایک شخص آج ایک لاکھ روپے ادھار دیتا ہے اور پانچ سال بعد مقروض اگر اسے ایک لاکھ روپے ہی

☆ چیف اکاؤنٹس آفیسر' وزارت خارجہ' اسلام آباد

واپس کرے تو قرض خواہ کو قوت خرید کے لحاظ سے نقصان ہو جاتا ہے اور مقروض فائدہ میں رہتا ہے۔

یہاں تک تو تمام باتیں متفق علیہ ہیں۔ اس صورت حال کے پیش نظر بعض لوگوں نے یہ کہنا شروع کیا کہ چونکہ شریعت انصاف کی علمبردار ہے اور چونکہ سود بھی اسی لئے حرام ہے کہ اس سے مقروض پر ظلم ہوتا ہے' لہٰذا ایک ایسی صورت میں جب قرض خواہ پر ظلم ہو رہا ہو تو شریعت کی طرف سے قرض خواہ کی مدد ہونا چاہئے' چنانچہ انہوں نے تجویز کیا کہ ایسے قرضوں پر افراط زر کی شرح کے مطابق اشاریہ بندی (Indexation) کے ذریعے اصل زر پر ایک رقم کا اضافہ کر دیا جائے۔

جب یہ بات تجویز ہوئی تو علماء کے بہت سے مراکز اور اداروں نے اس پر بحث شروع کی۔ ان میں سے بعض کا ذکر حافظ عاطف وحید صاحب نے بھی کیا ہے۔ علماء کا غالب رجحان (یا بہت حد تک متفقہ فیصلہ) یہ لگتا ہے کہ قرض حسن کی شکل میں اصل اعتبار مقدار کا ہے نہ کہ قدر و قیمت کا۔ لہٰذا جو کوئی قرض حسن دے' اسے اتنی ہی رقم واپس لینا چاہئے' اس پر اضافہ ربا یا مثل ربا ہے' لہٰذا حرام ہے۔ مولانا محمد طاسین صاحب اور شاہ محی الدین صاحب (جو "فکر و نظر" میں اس موضوع پر اپنی تحقیق شائع کر رہے ہیں) اس حل سے مطمئن نہیں ہیں' لیکن وہ اس بدیہی صورت حال کا سامنا بھی نہیں کر سکتے جس میں ایک قرض خواہ اصل زر سے زائد واپس لے تو وہ ربا کہلائے گا' چنانچہ وہ اس فقہی بحث میں پڑ گئے ہیں کہ کاغذی نوٹ اور سونا چاندی کا آپس میں کیا تعلق ہے اور کسی طرح سے اگر یہ ثابت کر دیا جائے کہ کاغذی نوٹ حقیقی زر نہیں ہیں تو پھر ان پر اضافہ کو جائز کرنے کا ایک فقہی عذر نکل آئے گا۔

اس نوٹ میں ہم فریقین کے موقف کی کمزوریوں پر بحث نہیں کرنا چاہتے۔ بلکہ قارئین کی توجہ نفس مسئلہ کی طرف مبذول کرانا چاہتے ہیں۔

اصل مسئلہ صرف قرض حسن سے متعلق نہیں ہے بلکہ اس کا اطلاق ان تمام مالیاتی حقوق اور واجبات پر ہوتا ہے جن میں وقت کسی طرح سے داخل ہو جائے۔ مثلاً ایک شخص اپنے جی پی فنڈ میں ایک رقم جمع کرواتا ہے' تیس یا پینتیس سال کی ملازمت کے بعد جب وہ ریٹائر ہوتا ہے تو قیمتوں میں تفاوت سے اس کی رقم کی قوت خرید بہت کم ہو چکی ہوتی ہے۔

اگر اسے اپنی اصل رقم لوٹائی جائے تو وہ بہت خسارے میں رہے گا' لہٰذا بعض علماء نے (جن میں حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ سرفہرست ہیں) اس مشکل سے نکلنے کے لئے ایک فقہی جزئیے کا سہارا لے کر جی پی فنڈ پر سود کو جائز قرار دے دیا۔ حالانکہ یہ امر واقع ہے کہ جی پی فنڈ پر جو اضافہ ملتا ہے وہ سود ہوتا ہے' سود ہی کی طرح اس کا حساب کیا جاتا ہے۔ اور حکومت بھی اسے سود ہی شمار کرتی ہے۔ لینے والا بھی عدالت میں جا کر اسے کسی دوسرے سود خور کی طرح وصول کر سکتا ہے۔ کسی فقہی موشگافی سے اگر ہم اس کو سود نہ شمار کریں تو نفس مسئلہ بدل نہیں جائے گا۔ یہ ایک مثال ہے جہاں علماء نے اصل مسئلہ سے نپٹنے سے گریز کیا ہے۔

اسی طرح سے اور مثالیں لیں۔ ایک شخص کسی فرم کو مال سپلائی کرتا ہے اور فرم اس کی ادائیگی میں تاخیر کر دیتی ہے۔ اس دوران میں قیمتوں میں اضافہ سے زر کی قوت خرید میں جو کمی ہوتی ہے اس کا خسارہ مال سپلائی کرنے والے کو ہوتا ہے۔ اس صورت حال سے عہدہ برآ ہونے کے لئے تمام کاروباری لوگ ادھار مال فروخت کرتے وقت ادھار کی قیمت میں نقد کی قیمت کے اوپر اضافہ کر دیتے ہیں۔ اس اضافہ کی روح یہی ہے کہ اگر وہ یہ مال نقد بیچتا تو وہ اس سرمایہ کو دوبارہ' سہ بار (وغیرہ) گردش میں لے آتا اور اب یہ مال ادھار میں بندھ جائے گا۔ لہٰذا وہ اس پر شروع میں ہی ایک اضافہ لگا دیتا ہے۔ علماء کے بہت بڑے گروہ نے اس کو بھی جائز قرار دیا ہے' حالانکہ یہی تو وہ دلیل ہے جو سود خور یا بینک سود وصول کرنے کے لئے دیتا ہے۔ یہ دوسری مثال ہے جس میں علماء نے اصل مسئلہ سے گریز میں عافیت سمجھی۔

اور مثالیں لیجئے۔ ایک شخص کسی مقدمے کے سلسلہ میں عدالت کے حکم پر ایک رقم بطور ضمانت یا پیشگی ٹیکس کے طور پر جمع کرا دیتا ہے۔ مقدمے کا تصفیہ ہونے میں چند برس بھی لگ جاتے ہیں۔ فیصلہ کے نتیجے میں اسے وہی رقم ملے گی جو اس نے جمع کرائی تھی' اور ظاہر ہے کہ یہ ایک خسارے کا سودا ہے۔ لہٰذا ایسے اشخاص عدالت سے باہر ہی سرکاری اہل کاروں سے رشوت دے دلا کر معاملہ طے کر لیتے ہیں۔ یعنی اس صورت حال سے نپٹنے کے لئے عام آدمی نے جو راستہ نکالا وہ یہ ہے کہ وہ سود سے تو بچ گیا لیکن رشوت میں ملوث ہو گیا۔ ظاہر ہے کہ یہ بھی کوئی مطلوب صورت حال نہیں۔ ایسی بہت سی اور مثالیں بھی دی

جا سکتی ہیں۔

ان باتوں کے جواب میں علماء کی طرف سے جو کچھ کہا جاتا ہے وہ حقیقت پسندی نہیں ہے۔ مثلاً یہ کہ قرض حسنہ ایک اخلاقی معاملہ ہے اس میں قربانی تو دینا ہی پڑے گی۔ یہ بات بہت کمزور ہے۔ ایک قربانی تو یہ ہے کہ آپ کسی کو اپنا مال عاریتاً دے دیں اور اس کے استعمال سے اپنے کو محروم کریں۔ اب ایک اور قربانی بھی مانگی جا رہی ہے کہ اصل زر کی قوت خرید میں جو کمی ہوئی ہے اسے بھی قرض حسن دینے والا برداشت کرے۔ ظاہر ہے اس قربانی کا مطالبہ وہی کر سکتے ہیں جنہوں نے خود کسی کو کبھی قرض حسنہ نہیں دینا' صرف فتویٰ ہی دینا ہے۔ اسی طرح سے بعض علماء کی طرف سے یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جو کوئی اپنے مال میں اضافہ کا غرض مند ہے وہ شرکت یا مضاربت وغیرہ کرے' قرض نہ دے۔ حالانکہ یہ تو ایک دوسرا معاملہ ہے' کوئی یہ تو نہیں پوچھ رہا کہ میں اپنے مال سے مزید مال کیسے کماؤں؟ مسئلہ تو یہ ہے کہ قرض دینے سے جو قوت خرید میں کمی ہو جاتی ہے اس کی تلافی کیسے ہو۔

خلاصہ کلام

خلاصہ کلام یہ ہے کہ افراط زر میں قوت خرید سے جو کمی واقع ہوتی ہے' تو ان مالی معاملات میں جن میں وقت شامل ہوتا ہے اس قوت خرید میں کمی کی تلافی کا کوئی حتمی اور تسلی بخش حل ابھی تک سامنے نہیں آیا۔ دونوں طرف کی آراء میں کچھ نہ کچھ کمزوری ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم مان لیں کہ یہ ان مسائل میں سے ہے جو جدید دور میں پیدا ہوئے ہیں اور جن پر شرعی نقطہ نظر سے ابھی مزید تحقیق کی ضرورت ہے۔ مسئلہ کو صرف قرض حسن کی حد تک محدود کرنے سے بات نہ بنے گی' نہ ہی اس سے گریز سے ہم کوئی باعزت حل پیش کر سکیں گے۔ واللہ اَعلم بالصّواب OO

اطلاع برائے قارئین

حکمت قرآن کے قارئین نوٹ فرما لیں کہ رمضان المبارک کی مصروفیات کے باعث حکمت قرآن کا فروری ۹۷ء کا شمارہ بروقت شائع نہ ہو سکے گا' اور اب انہیں فروری مارچ ۹۷ء کا مشترکہ شمارہ موصول ہو گا۔ (ادارہ)

سُورۃ البقرۃ

آیات ۹۴-۹۵

ملاحظہ: کتاب میں حوالہ کیلئے قطعہ بندی (پیراگرافنگ) میں بنیادی طور پر تین ارقام (نمبر) اختیار کئے گئے ہیں۔ سب سے پہلا (دائیں طرف والا) ہندسہ سورۃ کا نمبر شمار ظاہر کرتا ہے۔ اس سے اگلا (درمیانی) ہندسہ اس سورۃ کا قطعہ نمبر (جو زیر مطالعہ ہے اور جو کم از کم ایک آیت پر مشتمل ہوتا ہے) ظاہر کرتا ہے۔ اس کے بعد والا (تیسرا) ہندسہ کتاب کے مباحثِ اربعہ (اللغۃ، الاعراب، الرسم اور الضبط) میں سے زیر مطالعہ مبحث کو ظاہر کرتا ہے۔ یعنی علی الترتیب اللغۃ کیلئے ۱، الاعراب کیلئے ۲، الرسم کیلئے ۳ اور الضبط کیلئے ۴ کا ہندسہ لکھا گیا ہے۔ بحث اللغۃ میں چونکہ متعدد کلمات زیر بحث آتے ہیں اس لئے یہاں حوالہ کی مزید آسانی کے لئے نمبر ۱ کے بعد قوسین (بریکٹ) میں متعلقہ کلمہ کا ترتیبی نمبر بھی دیا جاتا ہے۔ مثلاً ۲:۵:۱(۳) کا مطلب ہے سورۃ البقرہ کے پانچویں قطعہ میں بحث اللغۃ کا تیسرا لفظ اور ۲:۵:۳ کا مطلب ہے سورۃ البقرہ کے پانچویں قطعہ میں بحث الرسم۔ وھٰکذا۔

۲:۵۸ قُلْ اِنْ كَانَتْ لَكُمُ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ عِنْدَ اللّٰهِ خَالِصَةً مِّنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۹۴﴾ وَلَنْ يَّتَمَنَّوْهُ اَبَدًا بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ ﴿۹۵﴾

۲:۵۸:۱ اللغۃ

اس قطعہ میں پہلی دفعہ آنے والے نئے مادے (یا ان سے بنے لفظ) تو صرف چار ہیں۔ پہلی آیت ایک مکمل شرطیہ جملہ ہے مگر اس میں بھی بیان شرط والا حصہ خاصا لمبا ہے لہٰذا ہم اس کے الگ الگ کلمات سے بحث کرنے کے بعد اس کے ترجمہ کی بات کریں گے۔

۲:۵۸:۱(۱) [قُلۡ اِنۡ کَانَتۡ لَکُمُ الدَّارُ الۡاٰخِرَۃُ عِنۡدَ اللّٰہِ خَالِصَۃً مِّنۡ دُوۡنِ النَّاسِ]

① "قُلۡ" (تو کہہ، آپ فرما دیجئے، کہہ دیجئے) مادہ، وزن وغیرہ کی بحث کے لیے دیکھئے [۲:۵۰:۱(۲)]

② "اِنۡ" (اگر) "اِنۡ" شرطیہ کے استعمال کے لیے دیکھئے البقرہ:۲۳ [۲:۱۷:۱(۱)]

③ "کانت" (تھی، ہے) یہ فعل ناقص "کان یکون" کا صیغہ ماضی واحد مؤنث غائب ہے۔ اس فعل کے معنی و استعمال اور تعلیل وغیرہ پر البقرہ:۱۰ [۲:۸:۱(۱۰)] میں بات ہوئی تھی۔ "کَانَتۡ" کا وزن "فَعَلَتۡ" اور شکل اصلی "کَوَنَتۡ" ہے، جس میں "واو" متحرکہ ماقبل مفتوح الف میں بدل جاتی ہے۔ فعل کا یہ صیغہ دراصل تو ماضی کا ہے مگر شرط کی وجہ سے ترجمہ حال یا مستقبل میں کیا جائے گا۔

④ "لَکُمۡ" (تمہارے لیے، تمہارا) لام الجر اور ضمیر مجرور کا مرکب ہے، یہاں "خبر مقدم" کے طور پر آنے کی وجہ سے ترجمہ "تمہارے ہی لیے / تمہارا ہی" سے ہوگا۔

⑤ "الدارُ الاٰخِرۃُ" (آخرت کا گھر، پچھلا گھر) یہ دراصل تو مرکب توصیفی ہے مگر اردو محاورے کی بناء پر اس کا ترجمہ مرکب اضافی کی طرح کر دیا گیا ہے، اگرچہ بعض نے "پچھلا گھر" کے ساتھ بھی ترجمہ کیا ہے۔ اس میں لفظ "الدار" کا مادہ "دور" اور وزن اصلی (لام تعریف کے بغیر) "فَعَلٌ" تھا اصلی شکل "دَوَرٌ" تھی جس میں واو متحرکہ ماقبل مفتوح الف میں بدل کر لفظ "دار" بنتا ہے جس کے معنی ہیں "گھر"۔ اس مادہ سے فعل مجرد کے باب اور معنی وغیرہ پر البقرہ:۸۴ [۲:۵۲:۱(۱)] میں کلمہ "دِیار" کے سلسلے میں بات

اس عبارت میں نیا لفظ صرف "خالصۃ" ہے۔ نمبر حوالہ اسی پر دیں گے۔

ہوئی تھی۔ "دار" اسی "دیار" کا واحد ہے۔ دوسرے لفظ "الاٰخِرَۃ" کے مادہ، وزن اور اس سے فعل مجرد وغیرہ اور "آخرت" کے اصطلاحی معنی پر مکمل بحث البقرہ:۴ [۲:۳:۱(۵)] میں کی جا چکی ہے اس لفظ کا اصلی ترجمہ تو ہے "سب سے پیچھے آنے والی"۔ لفظ "الدار" (گھر) چونکہ عربی میں مؤنث ہے اس لیے اس کی صفت (عربی میں تو) مؤنث ہی لائی گئی ہے۔ اردو میں لفظ "گھر" مذکر ہے اس لیے "الاٰخِرۃ" کا ترجمہ "الاٰخِر" (مذکر) کی طرح "پچھلا" کیا گیا ہے۔ تاہم اکثر نے اردو محاورے کی خاطر اس ترکیب توصیفی کا ترجمہ ترکیب اضافی کی طرح "آخرت کا گھر" ہی کیا ہے، ورنہ اس کا ترجمہ تو "آخری گھر" یا "پچھلا گھر" ہی ہے۔ بعض نے ترجمہ "عالمِ آخرت" کر لیا ہے جو بہرحال فارسی کی ترکیب اضافی ہی ہے۔ قرآن کریم میں یہ دونوں کلمات اس طرح ترکیب توصیفی (الدار الاخرۃ) کی شکل میں سات جگہ آئے ہیں مگر دو جگہ مرکب اضافی (دارُ الاخرۃِ) کی صورت میں بھی آئے ہیں جس کا لفظی ترجمہ ہی "آخرت کا گھر" بنتا ہے۔

(۶) "عِندَ اللهِ" (اللہ کے ہاں، خدا کے نزدیک) "عِندَ" پر بات [۲:۳۴:۱(۶۱)] میں لرزی ہے۔

(۷) "خَالِصَةً" کا مادہ "خ ل ص" اور وزن "فَاعِلَةٌ" ہے (جو عبارت میں منصوب آیا ہے)۔ اس مادہ سے فعل مجرد "خلَص یخلُص خُلوصاً" (نصر سے) آتا ہے اور اس کے بنیادی معنی ہیں "الگ ہو جانا" پھر اسی سے اس میں "خالص اور صاف ہونا" کے معنی پیدا ہوتے ہیں، یعنی کسی چیز سے ملاوٹ وغیرہ کا الگ ہو جانا۔ "خالِص" اور "صافِي" (صاف) دونوں عربی لفظ ہیں اور قریباً ہم معنی ہیں (اور اردو میں بھی اسی طرح استعمال ہوتے ہیں) مگر ان میں، اللسان اور المفردات کے مطابق، فرق یہ ہے کہ "خالص" اس چیز کو کہتے ہیں جس میں کچھ میل ملاوٹ تھی جو الگ (دور) ہو گئی۔ جبکہ "صافِي" (صاف) عموماً اس چیز کو کہتے ہیں جو شروع سے صاف اور خالص تھی۔ یہ فعل (خلَص) بنیادی طور پر فعل لازم ہے، مگر مختلف صلات کے ساتھ مختلف معنی بھی دیتا ہے۔ مثلاً "خلَص مِن..." کے معنی ہیں "... سے نجات پانا یا بچ جانا"۔ اور "خلَص الیٰ... یا خلَص بِ..." کا مطلب ہے "... تک پہنچ جانا"۔

● قرآن کریم میں اس فعل مجرد سے تو صرف ایک ہی صیغۂ ماضی (خلَصُوا) ایک ہی جگہ (یوسف: ۸۰) آیا ہے۔ جہاں یہ فعل بغیر صلہ کے اور اپنے بنیادی معنی (الگ ہونا) کے لیے ہی استعمال ہوا ہے۔ اس کے علاوہ مزید فیہ کے ابواب افعال اور استفعال سے بھی فعل کے دو چار صیغے آئے ہیں۔ مزید برآں مجرد اور مزید فیہ سے متعدد مشتقات پچیس کے قریب مقامات پر آئے ہیں، ان سب پر حسب موقع بات ہو گی، ان شاء اللہ تعالیٰ۔

● زیر مطالعہ لفظ "خالِصَة" اس فعل مجرد سے صیغہ اسم الفاعل ہے۔ اس کے آخر پر "ۃ" تانیث کے لیے نہیں مبالغہ کے لیے ہے (جیسے "راوی" سے "راوِیة" بنا لیتے ہیں) (یعنی "خاص طور پر الگ")، اس سے بصیغۂ مذکر اسم الفاعل (خالِص) بھی قرآن کریم میں بھی ایک جگہ (النحل: ۶۶) آیا ہے اور یہ لفظ (خالِصَة) بصیغۂ تانیث یا مبالغہ تو پانچ جگہ وارد ہوا ہے ـــ اس کے فعل مجرد کے مذکورہ معانی کو مدنظر رکھتے ہوئے اس (خالصة) کا ترجمہ "الگ، تنہا، خالص، بلاشرکت، خاص، مخصوص اور خاص کر" کی شکل میں کیا گیا ہے۔ اصل لفظی ترجمہ "خالص (الگ) ہونے والا یا والی" کی بجائے یہ تراجم اس لیے درست ہیں کہ یہاں اسم الفاعل بمعنی صفت بھی ہے اور اردو محاورے کا بھی یہی تقاضا ہے۔

(۸) "مِن دُونِ النَّاسِ": زیر مطالعہ عبارت کا یہ آخری حصہ دراصل تو ایک مرکب جاری ہے جو تین کلمات پر مشتمل ہے۔ اس میں "مِن" تو حرف الجر ہے جو یہاں ظرف "دُونَ" سے پہلے آیا ہے۔ اس کا ترجمہ "سے" ہی ہو گا۔ تاہم اگر یہ حرف الجر نہ بھی ہوتا تو صرف ظرف (منصوب) بھی یہی معنی دیتا۔

"دُون" (ادھر، اس طرف، سوا…، کو چھوڑ کر) کی لغوی تشریح وغیرہ البقرہ: ۲۳ [۲:۱۷:۱(۹)] میں گزر چکی ہے۔

"الناس" (لوگ، لوگوں، سب انسان) اس لفظ کے مادہ، وزن، اشتقاق وغیرہ کی بحث البقرہ: ۸ [۲:۷:۱(۳)] میں ہو چکی ہے۔

یوں "من دُون الناس" کا ترجمہ بنتا ہے "لوگوں / کے سوا / کو چھوڑ کر"۔ بعض نے اسے بامحاورہ بنانے کے لیے "الناس" کا ترجمہ "اور لوگوں سے" کیا ہے جو یہاں لفظ "دُونَ" کا تقاضا ہے۔ کیونکہ یہاں یہ تو مراد نہیں کہ لوگوں یا انسانوں کو چھوڑ کر یہ کسی اور مخلوق کے لیے خاص ہے۔ اس لیے یہاں "لکم" (تمہارے ہی لیے) کی وجہ سے ترجمہ "اور لوگوں سے" کرنا موزوں ہے۔ اسی کو بعض نے "دوسروں کو چھوڑ کر، دوسروں کے لیے نہیں، نہ اوروں کے لیے" اور بعض نے "بلا شرکتِ غیرے" سے ترجمہ کیا ہے۔ یہ سب تراجم محاورہ اور مفہوم کے لحاظ سے ہی درست ہیں، ورنہ ظاہر ہے اصل عبارت سے تو ہٹ کر ہیں۔

● یوں اس پوری زیرِ مطالعہ عبارت (قل ان کانت لکم الدار الاخرۃ عند اللہ خالصۃ من دُون الناس) کا لفظی ترجمہ بنتا ہے "کہہ دے تو اگر ہے تمہارے ہی لیے آخری گھر اللہ کے ہاں خالص (الگ) لوگوں کے سوا"۔ بعض نے "کانت لکم" کا ترجمہ (شاید محاورہ کی خاطر) "تم کو ملنا ہے" سے کیا ہے جو بلحاظ مفہوم ہی درست ہے۔ اسی طرح بعض مترجمین نے "لکم" اور "خالصۃ" دونوں کو ملا کر ترجمہ "خاص تمہارے ہی لیے، تمہارے ہی لیے مخصوص" کی شکل میں کیا ہے۔ بعض نے "محض تمہارے ہی لیے نافع ہے" سے ترجمہ کیا ہے، ظاہر ہے اس میں "نافع ہے" ایک تفسیری اضافہ ہے۔ بعض تراجم میں "عند اللہ" کا ترجمہ ہی نظر انداز ہو گیا ہے جو یقیناً سہو ہی ہے۔ "من دُون الناس" کے مختلف تراجم ابھی اوپر مذکور ہوئے ہیں۔

یہاں تک اس جملے کا ابتدائی حصہ جس میں صرف بیانِ شرط ہے مکمل ہوا ہے۔ جوابِ شرط اگلی عبارت میں آرہا ہے۔

۲:۵۸:۱(۲) [فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ]

① نیا لفظ اس میں "فَتَمَنَّوا" ہے۔ اس کی ابتدائی فاء (ف) تو فاء رابطہ ہے جو جوابِ شرط کے شروع میں آتی ہے۔ باقی لفظ "تَمَنَّوا" ہے (اس کی ساکن واو الجمع کو آگے ملانے کے لیے ضمہ (ـُـ) دیا گیا ہے) اس کا مادہ "م ن ی" اور وزن اصلی "تَفَعَّلُوا" ہے۔ اس کی اصلی شکل تو "تَمَنَّيُوا" تھی۔ پھر واو الجمع سے ماقبل والا حرف علت (جو یہاں "ی" ہے) گرا دیا جاتا ہے (یعنی "ـَـیُوا = ـَـوْا" کے اصول پر) یوں یہ لفظ "تَمَنَّوا" بن جاتا ہے (نیز دیکھئے حصہ "الاعراب")۔

● اس مادہ (م ن ی) سے فعل مجرد (جو قرآن کریم میں کہیں استعمال نہیں ہوا) کے باب اور معنی وغیرہ کی بحث تو البقرہ: ۷۸ [۲:۴۹:۱:۱(۲)] میں کلمہ "امانی" کے ضمن میں گزر چکی ہے۔ زیر مطالعہ لفظ (تَمَنَّوُا) اس مادہ سے باب تفعّل کا صیغہ فعل امر ہے۔ اس باب سے فعل "تَمَنَّى . يَتَمَنَّى" کے معنی ہیں: "..... کی آرزو کرنا۔ تمنا کرنا"۔ اردو کا لفظ "تمنا" اسی عربی فعل کے صیغہ ماضی کی بگڑی ہوئی شکل ہے جو اردو میں اس فعل کے مصدر کے معنی میں استعمال ہوتی ہے۔ باب تفعّل کے اس فعل کا اصل عربی مصدر "تَمَنِّيٌ" یا "اَلتَّمَنِّيْ" بنتا ہے۔

● "التمنی" کے اصل معنی تو ہیں: "دل میں کسی چیز کا اندازہ کرنا اور اس کا تصور لانا" جو محض ظن و تخمین پر مبنی بھی ہو سکتا ہے اور کسی ٹھوس بنیاد پر بھی۔ تاہم اکثر یہ بے حقیقت تصور کے لیے آتا ہے۔ اس لیے اس کے معنی میں "آرزو کرنا" کے علاوہ "بات گھڑ لینا اور جھوٹ کہنا" کے معنی بھی شامل ہیں۔ مثلاً کہتے ہیں "تمنی الحدیث" (اس نے حدیث یا بات گھڑ لی)۔ "التمنی" کے ایک معنی "پڑھنا" (قراءت یا تلاوت کرنا) بھی ہیں۔ اور قرآن کریم میں کم از کم ایک جگہ (الحج: ۵۲) یہ ان معنی میں بھی آیا ہے تاہم اس کا زیادہ استعمال پہلے معنی (آرزو کرنا۔ تمنا کرنا) میں ہی ہوتا ہے مثلاً کہتے ہیں "تَمَنَّيْتُ الشَّيْئَ" میں نے اس چیز کی تمنا کی یعنی دل سے چاہا کہ وہ مجھے مل جائے)۔ قرآن کریم میں اس فعل سے مختلف صیغے نو (۹) جگہ آئے ہیں۔

● زیر مطالعہ لفظ "تَمَنَّوُا" اس فعل سے فعل امر کا جمع مذکر حاضر کا صیغہ بھی ہو سکتا ہے جس کا ترجمہ ہو گا: "تم سب آرزو کرو" اور یہی لفظ اس فعل سے صیغہ ماضی جمع مذکر غائب بھی ہو سکتا ہے "ان سب نے آرزو کی" کے معنی میں۔ یعنی بلحاظ ساخت تو یہ صیغہ دونوں میں مشترک ہے۔ تاہم سیاق عبارت سے معلوم ہو جاتا ہے کہ یہاں یہ فعل امر کا صیغہ ہے (اس لفظ کے صیغہ ماضی اور امر کے اصل فرق کے لیے دیکھئے حصہ "الاعراب") اور اسی لیے اس (فتمنوا) کا ترجمہ "تو پھر آرزو کرو، تمنا کرو" کی صورت میں ہو گا۔ اور ایسا ہی کیا گیا ہے، بلکہ بیشتر حضرات نے لفظ "آرزو" ہی کا انتخاب کیا ہے۔

۲ [اَلْمَوْتَ] اس لفظ کی لغوی وضاحت (مادہ، وزن، فعل مجرد وغیرہ) البقرہ: ۱۹ [۲:۱۴:۱:۱(۲)] میں اور پھر [۲:۲۰:۱:۱(۲)] میں بھی کلمہ "امواتا" کے ضمن میں بھی گزر چکی ہے۔ لفظ "مَوت" اردو میں بھی عام مستعمل ہے۔ اس کا الگ ترجمہ کرنے کی ضرورت ہی نہیں۔

● [اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ] (اگر تم سچے ہو تو)۔ بعینہٖ یہی جملہ البقرہ: ۲۳ اور ۳۱ [۲:۱۷:۱:۱] اور [۲:۲۲:۱] میں گزر چکا ہے۔

● یوں اس پورے جملے (فتمنوا الموت ان کنتم صٰدقین) کا (جو در اصل سابقہ جملے کا جواب شرط ہے) ترجمہ بنتا ہے "پس / تو تم آرزو کرو موت کی اگر تم ہو سچے"۔ بعض نے "مَوت" کا بھی ترجمہ "مرنے (کی)" سے کر دیا ہے جو خالص اردو لفظ ہے۔ بعض نے اردو محاورے کا خیال کرتے ہوئے "آرزو کرو" کی بجائے "آرزو / تمنا کر کے دکھلا دو" کیا ہے۔ بعض نے ابتدائی فاء (ف) کا با محاورہ ترجمہ "تو بھلا" سے کیا ہے۔ بعض نے "صٰدقین" کا ترجمہ فعل مضارع کی شکل میں "سچ کہتے ہو" سے کیا ہے جسے اردو محاورے کے مطابق اور بلحاظ مفہوم ہی درست کہہ سکتے ہیں۔

۲:۵۸:۱ (۳) [وَلَنْ يَّتَمَنَّوْهُ اَبَدًا]

① ابتدائی "وَ" مستانفہ ہے "ترجمہ "اور" ہی کیا جا سکتا ہے۔ اگلا لفظ

② "لن یتمنّوہ" ہے جس کے آخر پر ضمیر منصوب (ہ) ہے جس کا اردو ترجمہ تو "اس کو" بنتا ہے مگر اردو کے فعل (آرزو کرنا) کی مناسبت سے اس کا ترجمہ یہاں "اس کی" ہی ہو سکتا ہے۔ باقی صیغہ فعل "لن یتمنّوا" ہے (خیال رہے جب ضمیر مفعول ساتھ نہیں لکھیں گے تو پھر واو الجمع کے بعد الف الوقایہ لکھنا ضروری ہے)۔ یہ ابھی اوپر بیان کردہ فعل "تمنّی ... یتمنّی" (آرزو کرنا) سے فعل مضارع معروف منفی "بلَن" صیغہ جمع مذکر غائب ہے۔ اس کا ترجمہ ہوگا "وہ ہرگز آرزو نہیں کریں گے"۔

③ [اَبَدًا] اس عبارت میں یہی لفظ نیا ہے۔ اس کے مادہ (اب د) سے فعل مجرد "اَبَدَ یَابُدُ اُبُودًا" (نصر سے) "وحشی ہونا۔ الگ تھلگ رہنا یا الگ گھومتے پھرنا" کے معنی دیتا ہے اور "اَبِدَ یَأبَدُ اَبَدًا" (سمع سے) کے معنی "غضبناک ہونا" بھی ہوتے ہیں۔ عام عربی میں اس مادہ سے مزید فیہ کے بعض ابواب سے بھی فعل استعمال ہوتے ہیں۔ اور بطور اسم "اَبَدٌ" بمعنی دہر یا زمانہ بھی استعمال ہوتا ہے اور اس کا خاص محاوراتی استعمال "اَبَدَ الآباد" یا "اَبَدَ الآبدین" (رہتی دنیا تک۔ ہمیشہ ہی کے مفہوم میں) ہوتا ہے تاہم قرآن کریم میں اس مادہ سے کسی قسم کا فعل یا اسم وغیرہ استعمال نہیں ہوا سوائے اس زیر مطالعہ لفظ (ابدًا) کے جو قرآن کریم میں ۲۸ جگہ وارد ہوا ہے۔

● یہ لفظ "ابدًا" ظرف ہے (اسی لیے یہ ہمیشہ منصوب استعمال ہوتا ہے) یہ صرف زمانہ مستقبل کے لیے آتا ہے اور نفی و اثبات یعنی منفی یا مثبت دونوں جملوں کے ساتھ استعمال ہوتا ہے مثلاً کہتے ہیں "اَفعَلُہ اَبَدًا" (میں اسے آئندہ ہمیشہ کروں گا) یا بطور نفی "لا اَفعَلُہ اَبَدًا" (میں یہ آئندہ کبھی بھی نہیں کروں گا)۔ اسی سے یہ استمرار (کسی حالت یا کیفیت وغیرہ کے ہمیشہ جاری رہنے) کا مفہوم دیتا ہے یعنی "ہمیشہ کے لیے" یا "ہمیشہ ہی" کے لیے ہے۔ اسی مفہوم میں یہ قرآن کریم میں اکثر "خالدین" یا "خالدًا" (حال)

کے ساتھ بطور تاکید (ابدًا) آتا ہے۔

● قرآن کریم میں یہ زیادہ تر تو منفی جملوں کے ساتھ (کبھی نہ ہوگا کے معنی میں) استعمال ہوا ہے تاہم مثبت جملوں کے ساتھ (ہمیشہ ایسا ہوگا کے معنی میں) بھی استعمال ہوا ہے جن پر حسب موقع بات ہوگی ان شاء اللہ۔ خیال رہے کہ "ابدًا" ماضی کے ساتھ کبھی استعمال نہیں ہوتا۔ مثلاً اگر کہنا ہو "میں ہرگز ایسا (کبھی) نہیں کروں گا" تو عربی میں کہیں گے "لا افعلہٗ" یا "لن افعلہ ابدا" ـ اور اگر کہنا ہو کہ "میں نے ہرگز کبھی ایسا نہیں کیا" تو اس صورت میں عربی میں کہیں گے "مافعلتہٗ" یا "لم افعلہٗ قطُّ" یعنی یہاں آخر پر "قطُّ" (جو مبنی بر ضمہ ہے) لگے گا۔ ایسے موقع پر "مافعلتہٗ ابدا" کہنا بالکل غلط ہوگا۔ بہرحال "ابدًا" کا اردو ترجمہ "کبھی بھی" ہوسکتا ہے اور مراد ہوگا "آئندہ کبھی بھی"۔

● اس حصۂ عبارت (وَلَنْ يَتَمَنَّوْهُ اَبَدًا) کا ترجمہ بنتا ہے "اور وہ ہرگز آرزو نہ کریں گے اس کی کبھی"۔ چونکہ اس میں نفی جحد بلَنْ بھی ہے (یعنی زور اور تاکید کے ساتھ نفی) اور ساتھ "ابدًا" بھی ہے اس لیے اردو محاورے میں ان دونوں کے مفہوم کو یکجا کرتے ہوئے ترجمہ "وہ اس کی آرزو ہرگز کبھی بھی نہ کریں گے" اور "ہرگز کبھی اس کی آرزو نہ کریں گے" سے کیا گیا ہے۔ بعض نے ضمیر مفعول (ہ) کی بجائے (اُس کی بجائے) "موت کی آرزو / مرنے کی آرزو نہ کریں گے" سے ترجمہ کیا ہے کیونکہ یہاں اس ضمیر کا مرجع (مَوْت) پہلے مذکور ہوا ہے۔

۲ : ۵۸ : ۱ (۴) [بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ]

① "بِمَا" (بسبب اس کے جو کہ) میں "بِ" سببیہ اور "مَا" موصولہ ہے جس کو مصدریہ بھی سمجھا جاسکتا ہے۔

② "قَدَّمَتْ" کا مادہ "ق د م" اور وزن "فَعَّلَتْ" ہے۔ اس مادہ سے فعل مجرد مختلف ابواب سے (اور مختلف مصادر کے ساتھ) مختلف معانی کے لیے استعمال ہوتا ہے تاہم اس کے تمام معانی میں "قَدَمٌ" (پاؤں۔ جمع اقدام) "اٹھانا" کا مفہوم ضرور شامل ہوتا ہے اور اس لیے اس کے معانی میں "آگے بڑھنا" (سبقت) کا تصور ہوتا ہے چاہے بلحاظ مکان (جگہ) ہو یا بلحاظ زمان یا بلحاظ شرف و مرتبہ ہو۔ مثلاً (۱) "قَدَم ... يقدُم قُدُومًا" (نصر سے) کے معنی ہوتے ہیں: "... سے آگے بڑھنا / ... کے آگے آگے چلنا" یعنی "صار قُدَّامهم" اور اسی سے آیا ہے "يقدُم قومَه يومَ القيامة" (ھود: ۹۸) (یعنی وہ اپنے لوگوں کے آگے آگے آئے گا قیامت کے دن)۔ اور کبھی ان ہی معنی کے لیے یہ فعل باب فتح سے (قدَم يقدَم قَدْمًا) بھی آتا ہے تاہم قرآن کریم میں یہ باب نصر سے ہی آیا ہے۔ (۲) "قدِم يقدَم قَدُمًا" (سمع سے) کے معنی "آ پہنچنا، آجانا" ہوتے ہیں۔ مثلاً کہتے ہیں "قدِم فلانٌ من سفرِہ (فلاں اپنے سفر سے واپس آگیا) اور اگر اس کے ساتھ "الی" کا صلہ لگے یعنی "قدِم الی ..." تو اس کے معنی "... تک پہنچنا، ... کی طرف متوجہ ہونا" ہوتے ہیں۔

اسی سے قرآن کریم میں آیا ہے " وقدِمْنا الی ما عمِلوا من عمل " (الفرقان:۲۳) یعنی " اور ہم پہنچے / متوجہ ہوئے ان کے اعمال (جو کچھ انہوں نے عمل کیا) تک / کی طرف " (۳) قدُم یقدُم قِدَمًا (کرم سے) کے معنی ہیں: "قدیم ہونا۔ بلحاظ زمانہ پیچھے (ماضی میں) رہ جانا۔ پرانا ہونا" اسی فعل سے عربی کی صفت مشبہ "قدیم" اردو میں بھی مستعمل ہے۔ قرآن کریم میں یہ فعل اپنے پہلے دو معنی (۱ و ۲ مندرجہ بالا) میں ہی استعمال ہوا ہے بلکہ اس فعل مجرد سے قرآن کریم میں صرف یہی دو صیغے آئے ہیں جو اوپر دو مثالوں میں مذکور ہوئے ہیں۔

● زیر مطالعہ صیغۂ فعل (قدَّمَتْ) اس مادہ سے باب تفعیل کا فعل ماضی معروف صیغہ واحد مؤنث غائب ہے۔ باب تفعیل کا یہ فعل "قدَّمَ ... یُقدِّمُ تقدیمًا" بنیادی طور پر بطور متعدی آتا ہے اور اس کے معنی "... کو آگے بھیجنا / کرنا / لانا / پیش کرنا" ہوتے ہیں۔ اور کبھی اس کے معنی بطور فعل لازم "آگے بڑھنا" (تقدَّم) کے بھی آسکتے ہیں اور اسی کے معنی (بطور متعدی) "کسی سے آگے نکل جانا" (سبَقَه) کے بھی ہوتے ہیں کہتے ہیں "قدَّم القومَ" (وہ لوگوں سے آگے نکل گیا) اس کے علاوہ مختلف صلات کے ساتھ بھی یہ مختلف معنی دیتا ہے۔ مثلاً " قدَّم بَیْنَ یَدَیْ فلانٍ " کے معنی ہیں "وہ فلاں سے پہل کر گیا" اور قرآن کریم (الحجرات:۱) میں یہ اسی معنی میں آیا ہے۔ "الی" کے صلہ کے ساتھ اس کے معنی "... کو قبل از وقت خبردار کرنا یا قبل از وقت کوئی حکم دینا" بھی ہوتے ہیں اور اسی سے قرآن کریم میں آیا ہے " وقد قدَّمتُ الیکم بالوعید" (میں نے تم کو پہلے ہی وعید (ڈراوا۔ دھمکی) دے دی تھی / سے آگاہ کر دیا تھا) اور "قدّم بِ" کے معنی "... سے قبل از وقت آگاہ کرنا" ہوتے ہیں۔ اوپر کی مثال میں "الی" اور "ب" دونوں کا استعمال ہوا ہے یعنی "... کو ... سے قبل از وقت آگاہ کر دیا" (الیہ اور بالوعید)

● قرآن کریم میں (باب تفعیل کے) اس فعل سے ماضی مضارع امر و نہی کے مختلف صیغے ۲۷ جگہ آئے ہیں، جن میں سے صرف زیر مطالعہ صیغہ (قدَّمَتْ) ہی ۱۴ جگہ آیا ہے۔ نیز باب تفعل اور استفعال سے افعال کے کچھ صیغے بھی چھ جگہ آئے ہیں۔ ان کے علاوہ مجرد و مزید سے مختلف مشتق و ماخوذ کلمات (مثلاً قدم، أقدام، قدیم، اقدمون، مستقدمین) ۱۳ جگہ وارد ہوئے ہیں۔

④ "اَیْدِیْهِمْ" (ان کے ہاتھوں نے) اس مرکب اضافی کا پہلا جزء "اَیْدِی" لفظ "ید" (ہاتھ) کی جمع مکسر ہے۔ "ید" کی لغوی (مادہ، وزن، باب فعل اور ساخت کلمہ وغیرہ کی) بحث پہلے البقرہ:۶۶ [۲:۴۲:۱(۶)] میں گزری تھی، پھر اسی لفظ (اَیْدِیْهِمْ) پر البقرہ:۷۹ [۲:۴۹:۱(۴)] میں بھی بات ہوئی تھی۔

● یوں اس عبارت (بِما قدَّمَتْ ایدیهم) کا ترجمہ بنتا ہے "بسبب اس کے جو کہ آگے بھیجا ان کے

ہاتھوں نے "بما" کا ترجمہ "جس واسطے" کیا گیا ہے جو کہ "اس کے واسطے جو کہ" کی زیادہ سلیس شکل ہے۔ بعض نے "ان اعمال بد/برے کام/بداعمالیوں کے سبب، ان گناہوں کے سبب، ان اعمال کی وجہ سے جو" کی صورت میں ترجمہ کیا ہے۔ ظاہر ان میں "بداعمالیوں، گناہوں" وغیرہ تفسیری اضافے ہیں۔ اسی طرح بعض نے "قدمت" "آگے بھیجا" کا ترجمہ (جو گناہ وہ) پہلے کر چکے ہیں" کے ساتھ کیا ہے اور بعض نے (جو اپنے ہاتھوں) "سمیٹ چکے ہیں"۔ اور "(جو) آگے کر چکے" کے ساتھ ترجمہ کیا ہے ان میں سے اکثر تراجم اردو محاورے اور اپنے مفہوم کے اعتبار سے درست ہیں ورنہ اصل الفاظ سے تو ذرا ہٹ کر ہی ہیں۔

● بعض مترجمین نے اردو میں فقرے کی ساخت کے تقاضے کو ملحوظ رکھتے ہوئے پہلے "بما قدمت ایدیھم" اور بعد میں (پہلی عبارت) "ولن یتمنوہ ابدا" کا ترجمہ کیا ہے۔ جو ترجمے کے قواعد کے لحاظ سے درست ہی ہے۔

۲:۵۸:۱(۵) [واللہ علیم بالظلمین]

① "واللہ" کی "واو" یہاں مستانفہ ہے، بلحاظ معنی اس کا سابقہ عبارت پر عطف (کا تعلق) ہو ہی نہیں سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ اس سے پہلی عبارت کے آخر پر وقف مطلق کی علامت (ط) ڈالی جاتی ہے کہ وہاں سابقہ مضمون ختم ہوتا ہے اور جملہ بھی مکمل ہو جاتا ہے۔ اسم جلالت (اللہ) کی لغوی بحث "بسم اللہ" کے ضمن میں ہوئی تھی۔

② "علیم" جو مادہ "ع ل م" سے صفت مشبہ بروزن "فعیل" ہے، اس کی مکمل وضاحت البقرہ: ۲۱ [۲:۲۰:۱] کے آخر پر ہو چکی ہے یعنی "خوب جاننے والا" "بالظلمین" کی ابتدائی "با (ب)" وہ صلہ ہے جو کبھی کبھی فعل "عَلِمَ" پر آتا ہے یعنی "عَلِمَهٗ" اور "عَلِمَ بِهٖ" دونوں کا مطلب ہے "اس نے اسے جان لیا"۔ اور کلمہ "الظالمین" (یعنی اردو کا "ظالموں") کی لغوی بحث پہلی دفعہ البقرہ: ۳۵ [۲:۲۶:۱] کے آخر پر ہوئی تھی۔

● اب یہ عبارت آپ کے لیے چنداں مشکل نہیں۔ اس کا لفظی ترجمہ بنتا ہے "اور اللہ تعالیٰ خوب اچھی طرح جاننے والا ہے ظالموں کو"۔ بعض نے "علیم" کا ترجمہ "خوب واقف" سے کیا ہے جبکہ بہت سے حضرات نے اس کا ترجمہ بصورت فعل یعنی "خوب جانتا ہے" سے کیا ہے جو اردو محاورے کے لحاظ سے درست ہے۔ ورنہ بظاہر تو یہ "یَعْلَمُ" کا ترجمہ لگتا ہے۔ بعض نے "کو خوب اطلاع ہے" سے ترجمہ کیا ہے جو تکلف اور تصنع سے خالی نہیں۔ اسی طرح "ظالمین" کا اردو ترجمہ "گناہگاروں" اور "بے انصافوں" بھی کیا گیا ہے جو بلحاظ مفہوم درست ہے۔

۲:۵۸:۲ الإعراب

اس قطعہ کی پہلی آیت تو ایک ذرا لمبا مکمل شرطیہ جملہ ہے، ہم اسے دو حصوں (بیانِ شرط اور جوابِ شرط) میں تقسیم کرکے اعراب پر بات کریں گے۔ دوسری آیت (۹۵) اعرابی لحاظ سے دو مکمل جملے ہیں۔ ہر ایک جملہ پر الگ الگ بات ہوگی۔

① "قل ان کانت لکم الدار الاخرۃ عنداللہ خالصۃ من دون الناس ۔ ۔ ۔ ؟ [قُل] فعل امر صیغہ واحد مذکر حاضر ہے [اِنْ] شرطیہ جازمہ ہے مگر یہاں فعل ماضی پر اس کا کوئی عمل نہیں ہوا، اگرچہ بعض نحوی کہتے ہیں کہ یہاں فعل "کانت" محلاً مجزوم ہے، مگر یہ محض تکلف ہے "اِنْ" تو صرف مضارع کو ہی جزم دیتا ہے۔ [کانت] فعل ناقص صیغہ ماضی واحد مؤنث غائب ہے۔ [لکم] جار مجرور (ل+کم) مل کر "کانت" کی خبر مقدم (جو اس کے اسم سے پہلے لائی گئی ہے) ہے اور اس تقدیم کی وجہ سے "لکم" کا ترجمہ "تمہارے ہی لیے" ہوگا۔ [الدارُ الاخرۃُ] مرکب توصیفی مل کر "کانت" کا اسم (لہٰذا) مرفوع ہے جو خبر سے مؤخر (بعد میں) لایا گیا ہے اور چاہیں تو یوں کہہ لیجئے کہ "الدارُ" (گھر) ہی دراصل اسم "کانت" ہے، لہٰذا رفع میں ہے اور "الآخرۃ" اس (الدار) کی صفت ہے اور اس لیے یہ حالت، جنس عدد وغیرہ سب پہلوؤں سے اپنے موصوف کے مطابق ہے (اور یوں یہ مرفوع بھی ہے) [عنداللہ] میں "عند" ظرف مکان ہے (اس لیے منصوب ہے) جو "اللہ" کی طرف مضاف ہے اور اسم جلالت اسی لیے مجرور ہے اور اس ظرف مکان کا تعلق اگلے لفظ "خالصۃ" سے ہے، یعنی یہ اس (خالصۃ) کے معنی مزید واضح کرتا ہے) کہ الگ اور وہ بھی اللہ کے پاس) [خالصۃ] یہ "الدار" کا حال ہے، اس لیے منصوب ہے، یعنی "خالص ہوتے ہوتے" یا "خاص کر"۔ ویسے یہ بھی ممکن ہے کہ "خالصۃ" کو فعل ناقص "کانت" کی خبر (لہٰذا منصوب) سمجھا جائے اور ابتدائی "لکم" کو اس کا متعلق خبر مقدم قرار دیا جائے۔ اس سے اردو ترجمہ میں کوئی فرق نہیں پڑسکتا۔ [من دون الناس] جار مجرور مل کر (جس میں مجرور "دُونِ الناسِ" میں ظرف مضاف اور اس کا مضاف الیہ شامل ہیں) حال/یا خبر (خالصۃً) کا حال مؤکدہ ہے، کیونکہ "دون" اختصاص کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ عربی میں کہتے ہیں "ھذا لی دونک / من دونِك" (یعنی یہ چیز میری ہی ہے، تیرا اس سے کوئی تعلق نہیں) اسی لیے "من دون الناس" کا ترجمہ "دوسروں کا نہیں، دوسروں کو چھوڑ کر" وغیرہ سے کیا گیا ہے (دیکھئے تراجم حصہ "اللغۃ" میں)۔ یہاں تک بیانِ شرط پورا ہوتا ہے۔

② فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ

[فَتَمَنَّوا] کی ابتدائی "فاء" وہ ہے جو جوابِ شرط پر آتی ہے خصوصاً جب جوابِ شرط میں معنی

مطلب" پایا جاتے ۔ تَمَنَّوا" یہاں فعل امر صیغہ جمع مذکر حاضر ہے ۔ اس میں آخری "ن" (تتمنون کا) امر کے مجزوم ہونے کی وجہ سے گر گیا ہے ۔ اب واو الجمع ضمیر الفاعلین "انتم" کے معنی دے رہی ہے اور اس صیغہ کے شروع سے ایک "ت" بھی گرا دی گئی ہے ۔ اصل صیغہ "تَتَمَنَّوا" تھا ، پھر باب تفعل اور تفاعل میں جہاں دو "تا" (ت) جمع ہوتے ہیں وہاں ایک "ت" کا حذف جائز ہے اور اس طرح یہ صیغہ امر بظاہر فعل ماضی کے صیغہ جمع مذکر غائب سے مشابہ ہو گیا ہے ، ورنہ دراصل تو دونوں صیغے الگ الگ "تَمَنَّوا" ماضی اور "تَتَمَنَّوا" امر) ہوتے ہیں ۔ [الموتَ] فعل "تَمَنَّوا" کا مفعول (لہٰذا) منصوب ہے ۔ [ان کنتم صادقین] یہ بذاتِ خود ادھورا جملہ ہے جو بیانِ شرط پر مشتمل ہے یعنی "ان" شرطیہ "کنتم" فعل ناقص مع اسم "انتم" ہے اور "صادقین" اس (کنتم) کی خبر (لہٰذا) منصوب ہے علامتِ نصب آخری نون سے پہلے والی یاء ماقبل مکسور (ـِ ی) ہے اور یہ جملہ (ان کنتم صادقین) ایک محذوف جواب شرط کا محتاج ہے جو "فافعلوا ھذا" یا "فتمنوا الموت" ہو سکتا ہے یعنی "اگر سچے ہو" تو یہ (موت کی تمنا کرنے والا) کام کر دکھاؤ ۔ یہ عبارت سابقہ (۲۱) کا جواب شرط ہے ۔ یہ دونوں جملے (۱ و ۲ مندرجہ بالا) مل کر ایک جملہ شرطیہ مکمل ہوتا ہے ۔

(۳) ولن یتمنّوہ ابدًا بما قدّمت ایدیھم

[وَ] یہاں استیناف کی ہے [لَن] حرف ناصب مضارع ہے جو نفی اور مستقبل کے معنی دیتا ہے [یتمنّوہ] میں "یتمنّوا" تو فعل مضارع منصوب (بِلَن) ہے جس میں علامتِ نصب آخری نون کا (یتمنّون کا) گر جانا ہے اس میں واو الجمع ضمیر الفاعلین "ھم" کے لیے ہے اور صیغہ فعل کے آخر پر ضمیر منصوب (ہ) اس فعل کا مفعول بہ ہے ۔ مفعولی ضمیر ہونے کے باعث یہاں واو الجمع کے بعد الف الوقایہ نہیں لکھا جاتا [ابدًا] ظرف زمان برائے مستقبل ہے جس کا تعلق فعل "یتمنوہ" سے ہے ۔ [بِمَا] باء الجر (جو یہاں سببیہ ہے) اور "مَا" موصولہ کا مرکب ہے [قَدَّمَت] فعل ماضی واحد مؤنث غائب ہے اور [اَیدِیھِم] مضاف "ایدی" اور مضاف الیہ "ھم" مل کر فعل "قَدَّمَت" کا فاعل ہے ۔ یہاں "ایدِی" مرفوع ہے جو آگے مضاف ہونے کے باعث خفیف "اَیدِی" ہو گیا ہے (تنوین ختم ہو گئی ہے) یہ لفظ اسم منقوص کی طرح رفع نصب جر میں "ایدٍ - ایدیًا اور ایدٍ" ہوتا ہے ۔ پھر مضاف ہوتے وقت رفع اور جر میں تو "ی" ساکن ہو جاتی ہے مگر نصب میں مفتوح (یَ) ہو جاتی ہے اور یہ پورا جملہ (قدّمت ایدیھم) اسم موصول ما ("بما" والا) کا صلہ ہے اور یوں یہ پورا مرکب جاری (بما قدمت ایدیھم) متعلق فعل "لن یتمنوا" بنتا ہے ۔ یعنی "جرأت تمنا" نہ کر سکنے کی وجہ بتاتا ہے ۔

④ واللہ علیم بالظالمین

[وَ] مستانفہ ہے اور [اللہ] مبتدأ مرفوع ہے۔ [علیم] اس کی خبر (لہٰذا) مرفوع ہے۔ [بالظالمین] جار مجرور (ب + الظالمین) مل کر متعلق خبر (علیم) ہے اور یہ پورا جملہ اسمیہ ایک الگ (مستانفہ) جملہ ہے۔

۲:۵۸:۳ الرسم

بلحاظ رسم عثمانی (قرآنی)، اس قطعہ میں صرف دو لفظ قابل ذکر ہیں یعنی "صدقین" اور "الظلمین"۔ ویسے یہ دونوں لفظ پہلے بھی گزر چکے ہیں۔ اور ان کا قاعدہ وہی جمع مذکر سالم کے حذف الف والا ہے، جو بیان ہو چکا ہے۔

① "صدقین" جس کی رسم املائی "صادقین" ہے، قرآن کریم میں یہاں اور ہر جگہ "بحذف الالف بعد الصاد" لکھا جاتا ہے۔

② "الظلمین" جس کی رسم املائی "الظالمین" ہے، یہ بھی قرآن کریم میں یہاں اور ہر جگہ "بحذف الالف بعد الظاء" لکھا جاتا ہے۔

خیال رہے دونوں لفظوں میں الف الفاعلین لکھنے میں محذوف ہوتا ہے مگر پڑھا ضرور جاتا ہے جسے پھر ضبط سے ظاہر کیا جاتا ہے۔

۲:۵۸:۴ الضبط

ان دو آیات کے کلمات میں ضبط کا تنوع زیادہ تر ساکن حرف علت، نون مخفاۃ اور اقلاب نون میم کے طریق ضبط سے تعلق رکھتا ہے، یا پھر افریقی مصاحف میں ف اور ق کے اعجام اور "ن" متطرف (آخر پر آنے والا نون) کے عدم اعجام سے متعلق ہے۔ تفصیل یوں ہے:

قُلْ، قُلْ / اِنْ ، اِنْ ، اِں / كَانَتْ، كَانَتْ / لَكُمْ ، لَكُمْ /

الدَّارُ، اَلدَّارُ، اَلدَّارُ / الْاٰخِرَةُ، اَلْاٰخِرَةُ ، اَلْاٰخِرَةُ / عِنْدَ،

عِنْدَ، عِنْدَ / اللّٰهِ، اَللّٰهِ، اَللّٰهِ / خَالِصَةً، خَالِصَةً / مِنْ ،

مِن ، مِں / دُوْنِ ، دُوْنِ ، دُوِں / النَّاسِ، اَلنَّاسِ، اَلنَّاسِ،

اَلنَّاسِ / فَتَمَنَّوُا، فَتَمَنَّوُا / الْمَوْتَ ، اَلْمَوْتَ، اَلْمَوْتَ /

اِن (مثل سابق)، کُنْتُمْ، کُنْتُمْ، کُنْتُمْ/ صٰدِقِیْنَ، صٰدِقِیْنَ، صَادِقِیْنَ، صَادِقِیْنَ/ وَلَنْ، لَنْ، لَن/ یَّتَمَنَّوْهُ، یَتَمَنَّوْهُ، یَّتَمَنَّوْهُ/ اَبَدًا، أَبَدًا، آبَدًا/ بِمَا، بِمَا، بِمَا/ قَدَّمَتْ، قَدَّمَتْ/ اَیْدِیْهِمْ، اَیْدِیْهِمْ، أَیْدِیْهِمْ، أَیْدِیْهِمْ/ وَاللّٰهُ (مثل سابق) عَلِیْمٌ، عَلِیْمٌ، عَلِیْمٌ، عَلِیْمٌ/ بِالظّٰلِمِیْنَ، بِالظّٰلِمِیْنَ، بِالظّٰلِمِیْنَ، بِالظّٰلِمِیْنَ۔

بقیہ : حرف اول

پیچھے مڑ کر دیکھنا پڑتا ہے تو بجائے اس کے اسے وہاں ان مسائل پر اجماع نظر آئے وہ وہاں بڑے بنیادی نوعیت کے اختلافات پاتا ہے' لہٰذا یا تو وہ خود ان مسائل میں الجھ کر رہ جاتا ہے اور یا تھک کر بیٹھ رہتا ہے۔

ان حالات میں ضرورت اس امر کی ہے کہ تمام سنجیدہ تحقیق کار ان بنیادی معاملات میں سے ایک ایک کو لے کر ان میں اتفاق رائے یا اجماع تک پہنچنے کی کوشش کریں اور جن معاملات پر کسی حد تک consensus (اتفاق رائے) ہو چکا ہو انہیں بار بار چھیڑنے اور ان پر مکرر بحث و نزاع سے گریز کیا جائے۔ اس لئے کہ ان پیچیدہ معاشی معاملات میں سو فیصد اتفاق کا ہونا تو شاید ممکن نہ ہو' علماء و محققین کی اکثریتی رائے اور رجحان کو ہی قبول کرنا پڑے گا۔ اور اگر ایسا نہ کیا جا سکے تو کم سے کم اس بات کا اہتمام کیا جائے کہ مخالف آراء کی بنیاد پر مختلف Schools of Thought (مکتبہ ہائے فکر) کی تشکیل ہو۔ اور یہ مان لیا جائے کہ فلاں معاملے میں اختلاف کی بنا پر فلاں فلاں مکتبہ ہائے فکر وجود میں آ چکے ہیں۔ اب یہ محقق کی پسند پر ہو گا کہ وہ اپنے آپ کو کس مکتبہ فکر سے منسلک کر کے اپنے دائرہ تحقیق کو پھیلاتا یا آگے بڑھاتا ہے۔ OO

پیش رفت

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور
کی سرگرمیوں کی اجمالی رپورٹ
(اکتوبر تا دسمبر ۱۹۹۶ء)

1) جامع القرآن کی توسیع :

بیسمنٹ کے اوپر مسجد کے برآمدے کا سٹرکچر تکمیلی مراحل میں ہے۔ امید ہے کہ ماہ رمضان سے قبل اس کا سول ورک مکمل ہو جائے گا (ان شاء اللہ) یہ کام حاجی محمد اقبال صاحب (جو کہ انجینئر ہیں) اپنے خرچ پر اور اپنی ہی نگرانی میں کروا رہے ہیں۔

جامع القرآن کے بیسمنٹ میں تازہ ہوا اور exhaust کا جو مسئلہ پیدا ہوا تھا۔ اس سلسلے میں SABRO کے نمائندے سے رابطہ کیا گیا۔ جس پر انہوں نے معائنہ کرنے کے بعد بتایا کہ یہ نقص لوورز کے ڈیزائن کی وجہ سے ہے۔ اگر اس پر لوورز کی بجائے جالی لگا دی جائے تو نقص دور ہو سکتا ہے لیکن اس سے گرد اور ٹریفک کے شور کا مسئلہ پیدا ہو جائے گا۔ لہٰذا فیصلہ ہوا کہ فی الحال اسی طرح رہنے دیا جائے۔

2) بزم ہائے خدام القرآن :

ناظم بزم ہائے خدام القرآن جناب محمد اشرف وصی صاحب نے نومبر کی مجلس عاملہ میں تحریری رپورٹ پیش کرنا تھی جو وہ نہ کر سکے۔ البتہ انہوں نے زبانی طور پر بتایا کہ فی الحال تنظیم کے رفقاء کے ذریعے رابطہ کیا جا رہا ہے جس کے ان شاء اللہ جلد ہی نتائج برآمد ہوں گے۔ کیونکہ ان کے پیش نظر مؤسس اور پرانے اراکین انجمن سے رابطہ کرنے کے بعد یہ معلوم کرنا ہے کہ کتنے حضرات فوت ہو چکے ہیں، کتنے اختلاف کرتے ہیں، کتنے باقاعدہ زرتعاون ادا کر رہے ہیں اور کتنوں سے زرتعاون حاصل کر کے انہیں فعال بنایا جا سکتا ہے۔ محترم صدر مؤسس نے تاکید فرمائی کہ آئندہ اجلاس میں لازماً تحریری رپورٹ پیش کی جائے۔

3) دارالقرآن وسن پورہ کی "تحریک خلافت" کو منتقلی :

مجلس شوریٰ کے اجلاس منعقدہ 30 / ستمبر کے فیصلہ کے مطابق مرکزی انجمن کی طرف سے تحریک خلافت کو دارالقرآن وسن پورہ کی منتقلی کی پیشکش کا خط لکھ دیا گیا ہے۔ لیکن تاحال ان کی طرف سے کوئی تحریری جواب موصول نہیں ہوا۔ ان کی زبانی منظوری کے بعد اس سلسلے میں کارروائی کا آغاز کر دیا گیا ہے۔

4) قرآن کالج میں نئے داخلے :

اس سال ایک سالہ رجوع الی القرآن کورس میں 20 طلبہ نے داخلہ لیا۔ ایک طالب علم کو ٹیوشن فیس اور کرایہ ہاسٹل معاف کیا گیا ہے' ایک کو نصف ٹیوشن فیس معاف ہے' ایک کو -/200 روپے ٹیوشن فیس معاف کی گئی ہے اور ایک طالب علم کو میس چارجز معاف کئے گئے ہیں۔ اس وقت ایک سالہ کورس کے شرکاء کی تعداد 17 ہے۔ کل رعایت کی رقم -/1300 روپے ہے۔

بی اے سال اول میں کل بائیس داخلے ہوئے ان میں سے 19 طلبہ تو وہ ہیں جنہوں نے قرآن کالج ہی سے FA کیا ہے۔ صرف تین نئے داخلے ہوئے۔ بی اے سال اول میں طلبہ کی موجودہ تعداد 13 ہے۔ ان میں سے 9 طلبہ کو مختلف مدوں میں رعایت حاصل ہے۔ رعایت کی کل رقم -/6150 روپے ہے۔

5) اکیڈمک ونگ و مکتبہ :

مرکزی انجمن کے شعبہ اکیڈمک ونگ کے تحت گزشتہ تین ماہ میں چھ نئی مطبوعات منظر عام پر آئی ہیں : (1) خطبات خلافت (2) استنبول سے رباط تک (3) مذہبی جماعتوں کے باہمی تعاون کے ضمن میں تنظیم اسلامی کی مساعی (4) انتخاب حدیث (5) اسلامی نظم جماعت میں بیعت کی اہمیت (6) صُفّہ 96ء (قرآن کالج کا میگزین)

اس کے علاوہ سات کتب کے نئے ایڈیشن زیور طبع سے آراستہ ہوئے۔ میثاق کے اکتوبر' نومبر اور دسمبر کے شمارے باقاعدگی سے شائع ہوئے۔ مطبوعات کے کام کی کثرت کی وجہ سے حکمت قرآن کا اکتوبر کا شمارہ بروقت شائع نہ ہو سکا لہٰذا اکتوبر اور نومبر کا مشترکہ شمارہ شائع کیا گیا۔ تاہم دسمبر کا حکمت قرآن بروقت شائع ہوا۔ ندائے خلافت حسب معمول ہر دوسرے ہفتے باقاعدگی سے شائع ہوا۔ "The Quranic Horizons" کا سال 96ء کی آخری سہ ماہی کا

شمارہ بروقت شائع ہوا۔

اکیڈمک ونگ میں گزشتہ ماہ عربی سیکشن کا آغاز ہوا۔ جس کے تحت عرب ممالک کے اشاعتی اداروں سے رابطے اور صدر مؤسس کی تصانیف کو عربی زبان میں منتقل کرنے کے کام کا آغاز کر دیا گیا ہے۔

علاوہ ازیں مرکزی انجمن کی مطبوعات کو فرانسیسی زبان میں منتقل کرنے کیلئے یکم نومبر سے ایک جزوقتی مترجم کی خدمات حاصل کرلی گئی ہیں' جو اس کام میں خصوصی مہارت رکھتے ہیں۔

مکتبہ انجمن نے گزشتہ تین ماہ کے دوران مبلغ -/1,44,275 روپے کی کتب فروخت کیں۔ آڈیو کیسٹس 3285 جن کی مالیت -/85,895 روپے اور ویڈیو کیسٹس 430 جن کی مالیت -/64,500 روپے ہے فروخت کی گئیں۔ علاوہ ازیں' میثاق' حکمت قرآن' ندائے خلافت اور The Quranic Horizons کی ترسیل و فروخت بروقت ہوتی رہی۔

6) شعبہ انگریزی :

اس شعبہ کے تحت شائع ہونے والے انگریزی سہ ماہی مجلے "The Quranic Horizons" کا چوتھا شمارہ شائع کیا گیا' جبکہ پانچویں شمارے (جنوری تا مارچ ۱۹۹۷ء) کا ادارتی کام اور کمپوزنگ وغیرہ مکمل ہو چکی ہے اور یہ ان شاء اللہ جنوری کے شروع میں شائع ہو جائے گا۔ صدر مؤسس کی تحریر "نبی اکرم ﷺ کا مقصد بعثت" کا انگریزی ترجمہ کچھ عرصہ قبل مکمل کیا گیا تھا۔ اب اس کو اغلاط کی درستی کے بعد پریس بھیج دیا گیا ہے۔

کینیڈا کی میک گل یونیورسٹی میں ایم اے اسلامیات کے لئے محترمہ شگفتہ احمد کا مقالہ Dr. Israr Ahmed's Political Thought and Activities کی کمپوزنگ' پروف ریڈنگ اور اغلاط کی تصحیح کے بعد مسودہ پریس بھیجا جا رہا ہے۔

علاوہ ازیں صدر مؤسس کے خطبات پر مشتمل انگریزی اخبارات کو چار پریس ریلیز جاری کئے گئے۔

شعبہ انگریزی میں ایک معاون خصوصی (قطب الدین رحمانی صاحب) کا آزمائشی طور پر تقرر کیا گیا۔ انہوں نے ندائے خلافت کے لئے دو انگریزی مضامین کو اردو میں منتقل کیا اور صدر مؤسس کی کتاب "سابقہ اور موجودہ مسلمان امتوں کا ماضی حال اور مستقبل" کے انگریزی ترجمے "Lessons from History" کو از اول تا آخر revise کیا۔ فی الوقت خطباتِ خلافت کا انگریزی ترجمہ کیا جا رہا ہے۔

7) شعبہ خط و کتابت کورسز :

ماہ اکتوبر تا دسمبر قرآن حکیم کی فکری و عملی راہنمائی کورس میں 46، عربی گرامر کورس حصہ اول میں 30، عربی گرامر کورس حصہ دوم میں 6 اور ترجمہ قرآن حکیم کورس میں 32 داخلے ہوئے۔

انجمن خدام القرآن بھارت (انڈیا) کی طرف سے ایک خط موصول ہوا تھا جس میں انہوں نے ہمارے ہاں جاری خط و کتابت کورسز کو وہاں پر جاری کرنے کی اجازت طلب کی تھی۔ اس مسئلہ کے مختلف پہلوؤں پر غور کیا گیا اور طے کیا گیا کہ انہیں اجازت دے دی جائے۔ لہٰذا انہیں خط و کتابت کورس چلانے کے لئے پورے نظام کو وہاں بروئے کار لانے کے لئے اختیارات کا خط لکھ دیا گیا ہے۔

8) اسلامک سیٹلائٹ اسٹیشن سے استفادہ :

ناظم شعبہ سمع و بصر جناب آصف حمید صاحب نے 30/ ستمبر کی مجلس شوریٰ میں بتایا تھا کہ اسلامک سیٹلائٹ اسٹیشن سے استفادہ کے لئے ہمارے موجودہ ویڈیو سسٹم میں جو تبدیلی درکار ہے اس کے سلسلے میں بھارت اور برطانیہ میں رابطہ کیا گیا ہے۔ وہاں کی مارکیٹ کے اعتبار سے اخراجات پچاس لاکھ روپے سے متجاوز ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ یہ ممکن ہے کہ ہم اپنی ریکارڈنگ پروفیشنل S-VHS سسٹم پر کریں اور پھر پاکستان میں موجود بہت سی کمپنیوں سے اس کو UMATIC یا BETA CAM پر اتروالیں۔ اس طرح یہ کام تقریباً پانچ لاکھ روپے میں ہو جائے گا۔ مشورہ کے بعد ڈاکٹر عارف رشید صاحب سے کہا گیا کہ وہ اس کام کے واقفان کار اور ماہرین سے رابطہ کریں اور مشورہ کے بعد اپنی رپورٹ پیش کریں۔ 25/ اکتوبر کی مجلس عاملہ میں ڈاکٹر عارف رشید صاحب نے بتایا کہ یہ خرچ پانچ لاکھ ساٹھ ہزار کے قریب بنتا ہے۔ آصف حمید صاحب نے بتایا کہ اس خرچ میں کمی ممکن ہے۔ ان کا رابطہ ابوظبی میں رفقاء سے ہوا ہے۔ وہاں سے ان کو مزید رعایت کے ساتھ یہ یونٹ مل سکتا ہے۔ آصف حمید صاحب نے کہا کہ اگر انہیں ابوظبی بھیج دیا جائے تو وہ یہ مکمل یونٹ وہاں سے خرید لائیں گے۔ اس کے اخراجات بھی وہاں کے رفقاء برداشت کریں گے۔ فیصلہ کیا گیا کہ آصف حمید صاحب کو وہاں بھیج دیا جائے۔ لہٰذا آصف حمید صاحب نومبر کے پہلے عشرہ میں ابوظبی گئے اور واپس آکر 19 نومبر کی مجلس عاملہ میں بتایا کہ انہوں نے ابوظبی میں مختلف کمپنیوں سے تفصیلی میٹنگز کی ہیں۔ جس میں سٹار پلس،

روسی ٹیلی ویژن کمپنیاں' سونی اور پینا سونک سے تفصیلی ملاقات شامل ہے۔ انہوں نے بتایا کہ وہ ابوظبی سے ایک digital کیمرہ اور ایک Low band UMATIC وی سی آر لے کر آئے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ پچاس عدد digital cassetes بھی لے کر آئے ہیں۔ ان کیسٹس کی life پچاس سال ہے اور یہ اس فیلڈ میں latest technology ہے۔

9) مرکزی انجمن کے عہدوں میں تبدیلی

مجلس عاملہ کے اجلاس منعقدہ 19 نومبر 96ء میں محترم صدر مؤسس نے فرمایا کہ اب تک محمود عالم میاں صاحب ناظم اعلیٰ اور مدیر عمومی دونوں کی ذمہ داریوں کو ادا کر رہے تھے۔ صدر موسس سمجھتے ہیں کہ یہ ذمہ داریاں دو الگ الگ افراد کے پاس ہونی چاہئیں۔ اس لئے یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ ناظم اعلیٰ (اعزازی) کی ذمہ داری محترم قمر سعید قریشی صاحب ادا کریں اور اس مقصد کے لئے وہ عصر تا عشاء انجمن کے دفتر میں یہ ذمہ داری نبھائیں۔ محمود عالم میاں صاحب کے ذمہ مدیر عمومی کی ذمہ داری ہوگی۔ مجلس عاملہ کے معتمد کی ذمہ داری آئندہ الطاف حسین صاحب کی بجائے جناب ڈاکٹر عارف رشید صاحب ادا کریں گے۔

10) نئی رکنیت :

اکتوبر تا دسمبر 96ء (تین ماہ کے دوران) کل اکیس افراد نے مرکزی انجمن کی رکنیت حاصل کی۔ تفصیل درج ذیل ہے۔

حلقہ محسنین	=	1
حلقہ مستقل ارکان	=	1
حلقہ عام ارکان	=	19
کل		21

اہم اطلاع

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کا الیکٹرانک میل کا پتہ تبدیل ہو گیا ہے۔ رابطے کے لئے نئے پتے درج ذیل ہیں :

anjuman@brain.net.pk
afzaal@academy.edunet.sdnpk.undp.org

دعوت رجوع الی القرآن کی اساسی دستاویز

ڈاکٹر اسرار احمد کی مقبولِ عام تالیف

مسلمانوں پر
قرآن مجید کے حقوق

خود پڑھیے اور دوستوں اور عزیزوں کو تحفۃً پیش کیجئے

نوٹ

اس کتابچے کا انگریزی، عربی، فارسی اور سندھی زبان میں بھی ترجمہ شائع ہو چکا ہے۔ اس کے حقوقِ اشاعت نہ ڈاکٹر صاحب کے حق میں محفوظ ہیں نہ انجمن کے

شائع کردہ

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن، لاہور